تذکرہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری رح

پروفیسر احمد سعید

تذکرہ خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری رح

پروفیسر احمد سعید

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

بار اوّل ۱۹۷۳ء

بار دوم ۱۹۹۴ء

محمد فیصل نے
زاہد بشیر پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت / 60 روپے

فہرست

پروفیسر احمد سعید

۲۱ر نومبر ۱۹۴۲ء کو مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے ۔آپ نے چشتیہ ہائی سکول لاہور (میٹرک ۱۹۵۸ء) گورنمنٹ کالج لاہور (بی۔اے، ۱۹۶۲ء) اور پنجاب یونیورسٹی (ایم۔اے، تاریخ ۱۹۶۵ء ایم اے، سیاسیات، ۱۹۶۶ء) میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۶۷ء میں ایم۔اے۔او کالج لاہور سے اپنی تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ۱۹۸۸ء تک یہاں بطور صدر شعبہ تاریخ کام کرتے رہے ۔اس وقت اسلامیہ کالج لاہور میں صدر شعبہ تاریخ کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

آپ کو بحیثیت پاکستانی مندوب قائداعظم انٹرنیشنل کانگرس (اسلام آباد، ۱۹۷۶ء) اور علامہ اقبال انٹرنیشنل کانگرس (لاہور، ۱۹۷۷ء) میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔آپ کے تحقیقی مضامین پاکستان کے اہم رسائل جرنل آف دی ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، جرنل آف پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی اور مجلہ تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

آپ کی مندرجہ ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی (خالد ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۷۲ء)
بار دوم ۱۹۸۵ء

(۲) حصول پاکستان (ایجوکیشنل ایمپوریم، لاہور، ۱۹۷۳ء)

(۳) ذکر مجذوب (احیاء العلوم الشرقیہ، لاہور، ۱۹۷۴ء)

(۴) بزم اشرف کے چراغ (ایجوکیشنل ایمپوریم، لاہور، ۱۹۷۵ء) بار دوم ۱۹۹۲ء

(۵) قائداعظم اور مسلم پریس (ایجوکیشنل ایمپوریم، لاہور، ۱۹۷۶ء)

(۶) گفتار قائداعظم (قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء)

(۷) اشاریہ قائداعظم (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۷۶ء)

(۸) اقبال اور قائداعظم (اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۷ء)

(۹) حیاتِ قائداعظم چند نئے پہلو (قومی کمیشن برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد ۱۹۷۸ء)

(۱۰) قائداعظم مسلم پریس کی نظر میں (قائداعظم اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۱ء)

(۱۱) تاریخ پاکستان (شاہد بک ڈپو، لاہور، ۱۹۸۱ء)

(۱۲) تحریک پاکستان معاشی اور معاشرتی تناظر میں (پاکستان سٹڈی سنٹر لاہور ۱۹۸۵ء)

(۱۳) مطالعہ پاکستان (شاہد بک ڈپو، لاہور، ۱۹۸۳ء)

(۱۴) انجمن اسلامیہ امرتسر (ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء)

(۱۵) روزنامہ زمیندار اور تحریک آزادی۔ توضیحی اشاریہ (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۸ء)

(۱۶) روزنامہ پیسہ اخبار اور تحریک آزادی۔ توضیحی اشاریہ (مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد زیر طبع)

(۱۷) اسلامیہ کالج کی صد سالہ تاریخ جلد اول (ریسرچ سوسائٹی آف پاکستان لاہور، ۱۹۹۲ء)

(۱۸) انجمن ترقی تعلیم مسلمانان ہند، امرتسر (زیر ترتیب)

(۱۹) مسلمانانِ پنجاب کی چند انجمنیں (زیر ترتیب)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھتیجے جناب مولانا عرفان صاحب (جنہیں حضرت خواجہ صاحب کی مجلس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی ہے) اپنے جمعہ کے خطبہ میں اکثر حضرت خواجہ صاحبؒ کا تذکرہ فرماتے رہتے ہیں۔ ان ہی چھوٹے چھوٹے دلچسپ اور پرلطف واقعات کو قلم بند کرکے میں نے ماہنامہ البلاغ میں ایک مضمون لکھا چونکہ یہ مضمون تشنہ رہ گیا تھا اس لیے جب مولانا عرفان صاحب سے دوسرے مضمون کے لیے رابطہ قائم کیا تو بات بڑھتے بڑھتے کتاب کی شکل اختیار کر گئی۔ دراصل یہ کتاب مولانا صاحب ہی کی وجہ سے لکھی گئی۔ اس کے بعد بندہ نے ان تمام حضرات سے رابطہ قائم کیا جو حضرت خواجہ صاحبؒ کی مجالس سے فیض اٹھا چکے تھے۔ کتاب کی تیاری کے دوران مختلف حضرات کو تقریباً چار سو کے لگ بھگ خطوط تحریر کیے۔ کتاب میں شامل ہر واقعہ حوالے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور سنی سنائی باتوں پر انحصار نہیں کیا گیا۔

کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں سب سے زیادہ جناب مکرمی ڈاکٹر غلام محمد صاحب (شاگرد خاص حضرت علامہ سید سلیمان ندوی) کا مشکور ہوں کہ انہوں نے مسودہ کو حرف بحرف پڑھا اور بیشمار مفید مشوروں سے نوازا۔ کتاب کے لیے مواد فراہم کرنے کے سلسلہ میں جن لوگوں نے تعاون کیا، ان میں مفتیٔ پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب۔ ڈاکٹر منظور احمد موجی صاحب (جنہوں نے ہندوستان سے نہایت طویل خطوط ارسال فرمائے) مولانا نجم الحسن تھانوی صاحب، حضرت مولانا حاجی محمد شریف صاحب، جناب حاجی شبیر محمد صاحب اور جناب سید محمد ابراہیم رزمی صاحب شامل ہیں۔ مولانا وکیل احمد شیروانی صاحب کا بھی مشکور ہوں کہ انہوں نے مجلس صیانۃ المسلمین لائبریری سے مطلوبہ کتب فراہم کیں۔

احمد سعید

۲۰ ؍ دسمبر ۱۹۷۳ء

دیباچہ

از ـــــــــــ مولانا نجم الحسن تھانوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمد و صلوٰۃ کے عرض ہے کہ یہ مختصر تذکرہ حضرت الحاج خواجہ عزیز الحسن صاحب تھانوی غوری رحمۃ اللہ علیہ خلیفۂ خاص حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت مولانا مولوی محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ مکرمی جناب پروفیسر احمد سعید صاحب کے اصرار پر معرض تحریر میں آرہا ہے۔ زیادہ تر ذاتی تاثرات کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ حضرت خواجہ صاحبؒ کی بزرگانہ شان کی معرفت تو اُنھی حضرات کو ہے جو خود اس مقام پر فائز اور دولت سے بہرہ ور ہیں۔ یہ تذکرہ تو حضرت خواجہ صاحبؒ کے بقول ؎

نقلِ ارشاداتِ مرشد میکنم — آنچہ مردم میکند بوزینہ ہم
اصل کی برکت سے لیکن کیا عجب — نقل سے بھی ہو وہی فیضِ اتم

کا مصداق ہے۔

حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنے شیخ و مرشد قدس سرہٗ کی جو سوانح حیات (اور دراصل کتاب و تصوف و سلوک) تین جلدوں میں تحریر فرمائی ہے۔ اس کی آخری جلد کے آخری حصہ میں انہوں نے اپنے ذاتی حالات بھی قلم بند فرمائے ہیں۔ نیز اسی سوانح کے حصہ دوم میں حضرت شیخ قدس سرہٗ سے تعلق کا تذکرہ بہ تفصیل اپنے قلم مبارک سے فرمایا ہے۔

اس عاجز نے حضرت خواجہ صاحبؒ کو اس وقت سے دیکھا جب عمر کے ابتدائی دور میں تھا یعنی ۷۔۸ سال کی عمر میں۔ تھانہ بھون میں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں جو حضرات مستقل قیام پذیر تھے یا کثرت سے آمدورفت رکھتے تھے، ان کی صورتیں بچپن کے انہی ایام سے حافظہ میں نقش ہیں۔ ان میں شاید سرِفہرست حضرت خواجہ صاحبؒ کی صورتِ مبارکہ ہے۔ قد لانبا، کشیدہ، رنگ بے حد صاف، گورا۔ داڑھی بالکل سفید، گھنی اور سیدھی، جسم دبلا پتلا چھریرا اور پھرتیلا۔ ناک نقشہ باریک، پرکشش اور جاذبِ نظر۔ لباس، وضع قطع اس طرح کہ کلیوں کا کرتہ، شرعی پاجامہ اور پانچ کلیا چکن یا ململ کی ٹوپی۔ طبیعت میں بے حد نفاست، نزاکت، صفائی اور سادگی۔ گرمی کے موسم میں عام طور پر اعلیٰ قسم کی چکن کے کرتے زیبِ تن فرماتے۔ نیچے آستین دار بنیان پہنتے اور کہنی سے اوپر تک باہیں اس باریک کرتے سے مرمریں انداز میں جھلکتیں۔ سردی کے موسم میں انگرکھا یا شیروانی اور سر پر بظاہر جلدی میں بے توجہی سے باندھی ہوئی پگڑی، مگر خداداد کشش اور حسن میں کمی کیا ہوتی کئی گنا زیادہ ہو جاتی تھی۔ چہرے پر اس قدر نورانیت اور شخصیت میں ایسی جاذبیت اور کشش تھی کہ نظریں ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بلا تشبیہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی فرشتہ نازل ہوا ہے اور زمین پر بے تکلف چل پھر رہا ہے۔ مزاج مبارک نہایت شگفتہ، چہرہ ہنس مکھ، طبیعت میں ہمہ وقت تازگی، جولانی اور چستی۔ آنکھوں میں چمک اور معصومیت، باتوں میں مٹھاس، زبان ٹکسالی اور شیریں۔ اختر شیرانی نے تو کسی موقع پر چاند کی مدح سرائی کی تھی کہ ؎

مہتاب ہے یا نور کی خوابیدہ پری ہے

الماس کی مورت ہے کہ منبر میں دھری ہے

مرمر کی صراحی مئے سیمیں سے بھری ہے

اور تیرتی ہے نیل کی موجوں کے سہارے

مگر خواجہ صاحبؒ "خوابیدہ پری نہیں، بیدار فرشتہ، الماس کی مورت نہیں بلکہ الماس کا "جیتا جاگتا مجسمہ" اور مرمر کی وہ صراحی" تھے جو "مئے سیمیں نہیں"، بلکہ مئے عشق و محبتِ حقیقی سے

لبریز تھی۔ بس یہ سمجھئے کہ ایک شمع تھی جس کے گرد پروانوں کا ہجوم رہتا تھا۔

ان کی شاعری عام شاعری نہ تھی۔ وہ عام شعرا سے ہٹ کر اپنی طرز کے، اپنے انداز کے، اپنی قسم کے، اپنی شان کے نرالے اور بے مثال شاعر تھے۔ ان جیسا شاعر نہ اس سے پہلے دیکھا نہ اس کے بعد۔

اسی مضمون کا ایک شعر جگر مراد آبادی کا یاد آتا ہے ؎

آجاؤ کہ اب خلوتِ غم خلوتِ غم ہے

اب دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہیں ہے

غرض یہ کہ حضرت خواجہ صاحب کا کلام ایک طرف عارفانہ شان لئے ہوئے ہے تو دوسری طرف ادبیت و شعریت سے بھرپور ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ روانی اور بے ساختگی کا حامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء کے مجمع میں ہمیشہ وہ مرکز بنے رہے۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود، دوسرے ہم عصر اور قدیم شعراء کے اچھے کلام کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور بڑی ستائش کے ساتھ نقل فرماتے۔ ایک مرتبہ تھانہ بھون میں ہمارے گھر کے مردانے میں تشریف رکھتے تھے۔ کرسی پر پاؤں دراز کئے، ہاتھ میں تسبیح لئے، کچھ گنگنا رہے تھے۔ فرمانے لگے کہ شوکت تھانوی کا ایک شعر مجھے بہت ہی پسند ہے ؎

ہر انسان فرضِ انسانی سے غافل ہوتا جاتا ہے

زمانہ آگ دے دینے کے قابل ہوتا جاتا ہے

اشعار ترنم سے پڑھتے تھے۔ آواز میں بلا کا سوز، غضب کی تاثیر اور بے پناہ کشش تھی۔ اپنا کلام سنانے کا انداز بھی ایسا نرالا، بے ساختہ اور جاذب تھا کہ جو اپنی نظیر آپ ہے۔ گھنٹوں مسلسل کلام سناتے رہتے اور سامعین سے داد لیتے رہتے اور جوش میں آ آ کر مزید سناتے رہتے۔ نہ تھکتے تھے نہ آواز مبارک میں تغیر پیدا ہوتا نہ ہمت میں کمی ہوتی نہ محفل کی دل چسپی میں۔ خود اور سامعین دیوانہ وار اسی طرح گھنٹوں بیٹھے رہتے اور سنتے رہتے۔ عام طور پر یہ مجالس اس وقت ہی ختم ہوتیں۔ جب نماز کا یا کھانے کا وقت آجاتا، شعر کو کئی دفعہ اپنے خاص انداز میں ترنم کے

ساتھ دہرایا اور فرمایا کہ میں نے بھی اس ردیف و قافیہ میں غزل کہی ہے۔ چند اشعار سنائے ؎

رنگ و غلق میں دنیا کی رونق بڑھتی جاتی ہے

مری نظروں میں پھیکا رنگ محفل ہوتا جاتا ہے

بہ مقدارِ جنوں مجذوب عاقل ہوتا جاتا ہے

کہ ہر شئے اپنا تو زائل، اُن کا حاصل ہوتا جاتا ہے

قدم مجذوب کے بڑھتے نہیں بڑھتے ہی جاتے ہیں

رفیق اک اک جدا منزل بہ منزل ہوتا جاتا ہے

ایک مرتبہ اپنا یہ شعر ترنم کے ساتھ پڑھ رہے تھے اور محظوظ ہو ہو کر بار بار دہرا رہے تھے۔

زیست کیا ہے ابتدائے دردِ دل　　موت کیا ہے انتہائے دردِ دل

ماموں شبیر علی صاحب بھی تشریف فرما تھے بولے کہ غالب نے بھی اس مضمون کو ادا کیا ہے۔ فوراً استفسار فرمایا کہ کیسے؟ ماموں صاحب نے شعر پڑھا ؎

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں

موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

سنکر پھڑک اُٹھے، تڑپ گئے اور بولتے کہ غضب کر دیا۔ واقعی استاد استاد ہی ہے۔ میرا شعر پھیکا پڑگیا۔ اسی طرح کوئی شخص ترنم سے اگر شعر پڑھتا۔ تو اس کو بھی بہت پسند فرماتے اور بڑے ذوق و شوق سے سنتے رہتے۔ وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ چنانچہ میرے ایک بہنوئی جناب محمد کاظم صاحب فاروقی تھانوی کہ جو شعر و سخن کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے، اور ہم لوگوں کے ساتھ وہ بھی خواجہ صاحب سے خصوصی تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ خواجہ صاحب کے اشعار اپنے انداز میں ترنم سے پڑھ کر سنائے۔ خواجہ صاحب بے حد محظوظ ہوئے اور بار بار فرمائش کرتے رہے اور دیر تک ان سے اپنا کلام سنتے رہے۔ میرے یہ بہنوئی انگریزی تعلیم یافتہ اور سگریٹ کے بھی عادی تھے۔ انھوں نے ایک دفعہ ان کے سامنے سگریٹ پینے کے لئے احتراماً اجازت چاہی اور معذرت کے انداز میں فرمایا کہ صاحب مجھے اس کی عادت ہے، اس لئے مجبور

ہوں ورنہ آپ کے سامنے گستاخی معلوم ہوتی ہے۔ خواجہ صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے
اجازت دے دی اور فرمایا کہ بس آپ بیٹھ کر ہمیں نہ دیں اور یہ شعر فرمایا ؎

نہ لوں گا میں سگرٹ، وہ دیں جتنا چاہیں
کہ میں کھینچتا ہوں دھواں دھار آہیں

اسی سلسلے کی ایک طویل کڑی یہ بھی ہے اور دراصل اس تحریر کا محرک یہی کڑی ہے کیونکہ دیگر حالات اور اشعار تو حضرت خواجہ صاحب کے مدون بھی ہیں اور نیز متعدد حضرات کی زبان پر جاری وساری بھی۔ مگر ان کی زندگی کا یہ گوشہ جس کا تعلق اس عاجز کے خاندان سے ہے صرف اس خاندان کے چند لوگوں کے گوشۂ یاد میں محفوظ ہے۔ اس میں سے بھی کئی حضرات اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ اگر کچھ عرصہ مزید گزر گیا تو شاید اس داستان کا سنانے والا بھی کوئی نہ رہے۔ اس لئے جی چاہتا ہے کہ یہ واقعات ذرا تفصیل سے قلمبند کر دیئے جائیں تاکہ حضرت خواجہ صاحبؒ سے تعلق رکھنے والے حضرات خصوصاً اور اہلِ ذوق حضرات عموماً اس سے محظوظ ہوں کہ ؎

نوشتہ بماند سیہ بر سفید نویسندہ را نیست فردا امید

اور ؎

يَكُونُ الْخَطُّ فِي الْقِرْطَاسِ دَهْرًا وَكَاتِبُهُ رَمِيمٌ فِي التُّرَابِ

حضرت حکیم الامت مجدد الملت مولانا مولوی شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہم کی سوانح مرتب کرنے کی لگن میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنی ملازمت سے تین سال کی طویل رخصت لی اور مستقل تھانہ بھون میں قیام فرمایا۔ یہ تین سال کا عرصہ خصوصیت سے ایسا ہے کہ اس عاجز کو انہیں ہر طرح سے ان کا قرب و تعلق رہا۔ اور ان کی شفقتوں اور توجہات سے بہرہ مند ہونے کا موقع ملا۔ اس وقت احقر کی عمر ۱۳-۱۴ سال کے لگ بھگ تھی۔ جس ماحول میں زندگی گزری وہ اس قدر محتاط تھا کہ اس عمر میں مجھے زندگی کی ضروریات تک کا علم نہ تھا۔ اس لئے قدرتی طور پر طبیعت میں بے حد شرم، حجاب، جھجک اور عجز و انکسار تھا۔ (جس کو آج کل کی اصطلاح میں احساسِ کمتری کہیئے) اس زمانہ

میں میرے سب سے بڑے بھائی، جناب حافظ سید شمس الحسن صاحب تھانوی مدت فیوضہم کی شادی خانہ آبادی حضرت مولانا محمد شبیر علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی مرحومہ کے ساتھ ہونا قرار پائی۔ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ہم ماموں صاحبؒ موصوف کی ہی کی زیر تربیت رہے اور ایک ہی جگہ، اس طرح کہ گھر اگرچہ الگ الگ تھے مگر عملاً متحد ہی تھے۔ یعنی ایک مردانہ حصہ درمیان میں تھا اور اس کے دونوں طرف دو زنانے مکان تھے۔ ایک میں ہم رہتے تھے اور ایک میں ماموں صاحبؒ۔ مردانہ مکان مشترک تھا اور دونوں گھروں سے اس میں راستہ تھا۔ یہ شادی ماہ نومبر ۱۹۳۵ء شعبان ۱۳۵۴ھ میں ہوئی۔ والدہ صاحبہ مدظلہا نے حضرت خواجہ صاحب کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ شمس الحسن سلمہ کی شادی ہو رہی ہے، اس کے لئے سہرا لکھ دیجئے۔ خواجہ صاحبؒ نے اس پر خاص توجہ نہ فرمائی اور جواب میں کہلا دیا کہ میں سوانح کی ترتیب میں اس قدر مصروف ہوں کہ اس کام کا وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ جب شادی کی تاریخیں قریب آگئیں تو والدہ صاحبہ حضرت خواجہ صاحبؒ کے گھر تشریف لے گئیں اور ان کی اہلیہ سے کہہ آئیں کہ شادی کے موقع پر سہرا نہ ملا تو آپ سے لڑائی ہو جائے گی۔ چنانچہ شادی سے کچھ روز، یعنی تقریباً دو چار روز قبل حضرت خواجہ صاحبؒ نے اس طرف توجہ فرمائی۔ اور شادی کے دن ایک بڑے گتے پر خوشخط کاتب سے لکھوا کر "اسلامی سہرا" پیش کیا۔ مجھے یاد ہے کہ صبح ہی صبح لے کر تشریف لائے۔ اور مردانے میں دری پر بیٹھ کر چند حضرات کی موجودگی میں پورا سہرا خود پڑھ کر سنایا۔ اسی انداز میں اور اسی ترنم میں جو ان کا طرہ امتیاز تھا۔ اور جو ابھی تک کانوں میں اسی طرح گونج رہا ہے کہ جیسے سامنے بیٹھے پڑھ رہے ہیں۔ ہر ہر شعر پر سامعین جھوم اٹھتے اور بار بار پڑھا جاتا۔ یہ سہرا ادب اور شعریت کے لحاظ سے اس قدر بلند ہے کہ اس کے لئے درمیان میں ایک واقعے کا نقل کرنا مناسب ہو گا جو میں نے حضرت خواجہ صاحبؒ ہی سے اس وقت سنا، جب یہ محفل سونی ہو چکی تھی۔ یعنی بھائی صاحب مدظلہ کی اہلیہ کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور حضرت تھانوی قدس سرہ کا وصال بھی ہو چکا تھا یعنی ہمارا گھر اور وطن دونوں ویران ہو چکے اور حضرت خواجہ صاحبؒ آخری دفعہ تھانہ بھون تشریف لائے ہوئے تھے اور احقر ان کے

ساتھ ساتھ رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ ایک روز دوپہر کے کھانے پر ذکر فرمایا کہ للت پور میں آل انڈیا مشاعرہ تھا میں بھی مدعو تھا مگر میں نے انکار لکھ بھیجا۔ اس طرف سے اصرار ہوتا رہا مگر میں نے انکار ہی کیا۔ اتفاق یہ کہ عین مشاعرے کے دن مجھے کسی کام سے للت پور جانا پڑا۔ مشاعرہ رات کے وقت تھا اور پشاور سے لے کر کلکتہ اور بمبئی تک کے چوٹی کے شعراء مدعو تھے۔ اس لئے دل چاہا کہ مشاعرہ میں جاکر شعراء کا کلام سنوں۔ چنانچہ پہنچ گیا۔ دیکھا کہ بہت بڑا پنڈال ہے جو حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ اسٹیج پر بھی تل دھرنے کی جگہ نہیں۔ بڑے بڑے نامور شعراء اپنے کلام کے جوہر دکھانے کو حاضر ہیں۔ میں بھی مجمع میں چھپ کر پیچھے بیٹھ گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا صدارت کسی بہت بڑے ہندو شاعر کی تھی۔ میں شعراء کا کلام سنتا رہا اور محظوظ ہوتا رہا۔ مجھے کسی نے پہچان لیا اور اسٹیج پر چٹ بھیج دی کہ مجمع میں خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب موجود ہیں۔ کوئی صاحب غزل پڑھ رہے تھے کہ یکایک ان کو روک کر صدر مشاعرہ نے اعلان کیا کہ معلوم ہوا ہے کہ خواجہ صاحب اس مجمع میں تشریف رکھتے ہیں لہٰذا ان سے درخواست ہے کہ وہ اسٹیج پر تشریف لے آئیں خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ یہ سن کر مجھے بہت پریشانی ہوئی اور میں حیران تھا کہ اب کیا کروں کیونکہ بہت عام حالت میں تھا، کپڑے بھی میلے اور مشاعرے کی شرکت کی تیاری بھی کچھ نہیں۔ ابھی اسی کشمکش میں تھا کہ آواز آئی صاحب تشریف لے آیئے کیونکہ مشاعرے کی کارروائی اس وقت تک شروع ہی نہ ہوگی جب تک آپ اسٹیج پر تشریف نہ لائیں گے۔ اگر دیر فرمائیں گے تو پھر ہم خود آپ کو تلاش کرلیں گے۔ فرماتے تھے کہ چار و ناچار مجھے جانا پڑا۔ جیسے ہی اٹھا سارے مجمع میں تالیاں اور نعرے گونجنے لگے۔ اسٹیج پر پہنچا، سب کھڑے ہوگئے اور بہت خوش ہوئے جو صاحب غزل پڑھ رہے تھے۔ اب انہوں نے اپنی غزل پوری کی۔ اور اس کے بعد مجھ سے غزل کی فرمائش ہوئی۔ میں نے کہا طرحی مشاعرہ ہے اور میں نے اس پر کوئی غزل نہیں کہی۔ اس لئے مجھے معاف رکھا جائے مگر میرا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اور بالاتفاق یہ مطالبہ ہوا کہ آپ تمام پابندیوں سے مستثنیٰ ہیں۔ اپنی کوئی بھی غزل سنا دیجئے۔ غرض میں نے اپنی ایک مرصع غزل سنائی۔ ہر ہر شعر پر بے حد داد ملی۔ اور بار بار

پڑھوایا گیا۔ شعراء نے تو اپنے کو پیٹ پیٹ لیا اور کہا کہ خواجہ صاحبؒ! یہی الفاظ اور تراکیب آپ باندھتے ہیں تو شعر آسمان سے اونچا ہو جاتا ہے ہم باندھتے ہیں تو بے جان ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ غزل کے چند شعر نقل کرتے کو بے ساختہ جی چاہتا ہے جو حضرت خواجہ صاحبؒ سے سنتے ہوئے حافظے میں رہ گئے ہیں

کوئی مزا مزا نہیں کوئی خوشی خوشی نہیں

تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں

میکشو! یہ تو میکشی رندی ہے میکشی نہیں

آنکھوں سے تم نے پی نہیں آنکھوں کی تم نے پی نہیں

بیٹھا ہوں میں جھکائے سر نیچی کئے ہوئے نظر

بزم میں سب سہی مگر وہ جو نہیں کوئی نہیں

شیشہ ہے جام ہے نہ خم اہل تو رندیں ہیں گم

لاکھ سجائیے ہو تم بزم ابھی سجی نہیں

دل ہے امید و بیم میں ، کشمکش عظیم میں

بیٹھے ہوئے حریم میں ہاں ہے کبھی کبھی نہیں

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک ، آہ مگر ابھی نہیں

غم ہے یہ دل لگی نہیں ، رونا ہے یہ ہنسی نہیں

بہرحال مشاعرہ ختم ہوا۔ اور اب رات کے ڈیڑھ دو بجے تھے کہ سب شعراء مل بیٹھے۔ لکھنؤ کے ایک بہت بڑے شاعر (جن کا نام خواجہ صاحبؒ نے لیا تھا مگر میں بھول گیا) ـــــــ اور پورے ہندوستان میں سہرا کہنے میں استاد مانے جاتے ہیں اور کوئی ان کے مقابلے میں سہرا نہیں کہہ سکتا۔ انہوں نے خواجہ صاحب سے کچھ حریفانہ چشمک کے انداز میں خود اعتمادی کے ناز کے ساتھ کہا کہ "سنا ہے خواجہ صاحبؒ! آپ نے سہرا لکھا ہے" خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ صاحب! میں کیا سہرا لکھ سکتا ہوں۔ بس یہ سمجھئے کہ تک بندی کی ہے۔ بولے کہ سنائیے۔ خواجہ صاحبؒ نے

فرمایا کہ آپ اس فن کے مسلمہ استاد ہیں۔ آپ کے سامنے اپنا سہرا سنانا دعوے کی صورت ہے اور مجھے دعویٰ ہے نہیں۔ اس لئے بے ادبی سے معاف کیا جاؤں تو مجھ پر نوازش ہو مگر وہ نہیں مانے۔ اور سب نے بھی اصرار کیا۔ اس لئے سنانا پڑا۔ خواجہ صاحبؒ کا بیان ہے کہ وہ صاحب جو اس فن کے استاد ہیں، ہر ہر شعر پر تڑپ گئے۔ اور ایک ایک شعر کو چار چار پانچ پانچ دفعہ اور بعض کو دس دس دفعہ سنا۔ شعر سُن سن کر اچھل پڑتے تھے اور اپنے آپ کو پیٹ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ غضب کر دیا۔ کہاں سے لائے یہ تشبیہیں، اور کیسے ترتیب دیا ان مضامین کو۔ بقیہ رات اسی میں گزر گئی اور سہرا مکمل نہ ہوا۔

اس نرالے سہرے کے چند اشعار نقل کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ ذہن میں رہے کہ نوشہ کا نام شمس یعنی آفتاب ہے اور وہ عالم دین، حافظ، قاری، وضع قطع میں مشرع اور جوانِ صالح ہے۔ پھولوں کا سہرا بنا کر باندھنا خلاف شرع ہے اس لئے ایک عالم باعمل سہرا کیسے باندھ سکتا ہے۔ لہٰذا شاعر کا تخیل یہ ہے کہ چونکہ فضل و ہنر اور علم کی دولت سے مالا مال ہے اس لئے تجھے ظاہری سہرے کی کیا ضرورت ہے؛ بلکہ یہی ظاہری و باطنی خوبیاں تیرے لئے ہزار سہروں سے بڑھ کر ہے۔ اب اسی تخیل کو ذہن میں رکھیئے کہ نوشہ کے سر پر رسمی اور غیر شرعی سہرا نہیں ہے مگر حضرت خواجہ صاحبؒ نے کتنے حقیقی اور معنوی سہرے باندھے ہیں کہ جس سے ظاہری سہرے کی نہ کوئی ضرورت رہتی ہے نہ حقیقت ہے

تجھے ہرگز نہیں درکار اے شمس الحسن سہرا
کہ تجھ سے ہے خود ترا فضل و ہنر اور علم و فن سہرا

کوئی سہرا نہیں پھر بھی ڈھکا بیٹھا ہے سہروں سے
کہ شمس حسن تو ہے تیری ہے ہر ہر کرن سہرا

ہر اک جانب سے اک بارش تار نظر تجھ پر

تیرے سر باندھتی ہے انجمن کی انجمن سہرا

تجھے حاجت ہی کیا ان فانی پھولوں کے سہرے کی

کہ تو وہ گلبدن ہے جس کا ہے سارا بدن سہرا

فضیلت کا عمامہ تجھ سے کرتا ہے یہ سرگوشی

کہ میں ہوں تاج سر میں کس ترا اے جان من سہرا

کلام اللہ جب پڑھتا ہے منہ سے پھول جھڑتے ہیں

خوش الحانی کا تیرے سر پہ ہے اے شیریں دہن سہرا

سمایا جاتا ہے دل میں کھبا جاتا ہے نظروں میں

یہ لطف آتا کہاں رخ پر جو ہوتا جان من سہرا

دکھاتی ہے غضب کا بانکپن یہ سادگی تیری

بھلا کوئی دکھا سکتا تھا ایسا بانکپن سہرا

برت سکتا ہے رسم کفر کیوں کر مولوی ہو کر

مرا انور شاہ کیوں باندھے ترا اے برہمن سہرا

یہ وہ سہرا نہیں جو بعد شادی کے اتر جائے

رہے گا پاس یہ تا عمر مثل جان و تن سہرا

وہ یوم کامرانی ہے کہ ہوتا آج اگر تو بھی

بجائے تیشہ تیرے سر پہ ہوتا کوہکن سہرا

خوشی سے ہر کہ و مہ کو کہ خوش ہو ہو کے گاتے ہیں

ادھر تو بلبل و قمری، ادھر زاغ و زغن سہرا

حضرت خواجہ صاحبؒ نے اس سہرے میں اپنے شیخ کا جو اس صدی کے مجدد بھی تھے، ذکر بھی

فرمایا ہے اور ان کی اس شان کی طرف اشارہ فرمایا ہے ؎

صدی بھی چودھویں اور چودھویں کا چاند ہے تو بھی

ادھر اِس صدی کا ہے سہرا تھانہ بھون سہرا

بفیضِ مولویِ معنوی تھانوی میں نے

بحمداللہ کہا ہے، درخور تھانہ بھون سہرا

ابھی تک سب سے تھے ممتاز سہرے ذوق و غالب کے

مگر آج ان پہ بھی مجذوبؔ کا ہے خندہ زن سہرا

غرض یہ کہ ذکر یہ ہو رہا تھا کہ عین شادی کے روز خواجہ صاحبؒ سہرا لکھ کر دے گئے۔ راقم کو چونکہ ابھی کے انداز میں پڑھنے کی خوب مشق تھی۔ اس لئے یہ سہرا گھر میں اور اس کے بعد جگہ جگہ مجھ ہی سے سنا جاتا۔ چند روز بعد رفتہ رفتہ اس امر کی اطلاع حضرت خواجہ صاحبؒ کو بھی ہو گئی کہ یہ لڑکا سہرا اچھی طرز و انداز میں پڑھتا ہے۔ چنانچہ خواجہ صاحبؒ نے سننے کی خواہش ظاہر فرمائی مگر حجاب شرم اور ندامت کی وجہ سے کسی طرح ان کے سامنے زبان ہی نہ کھلتی تھی۔ آخر کئی روز کے بار بار اصرار و تکرار سے زبان کھلی اور با دلِ نخواستہ دھڑکتے ہوئے دل اور لرزتے ڈرتے سہرا سنانا شروع کیا۔ خواجہ صاحب نے بے حد قدر دانی فرمائی اور بہت خوشی کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد تقریباً روزانہ بلکہ دن میں کئی کئی بار یہ شغل رہا کرتا کہ خواجہ صاحبؒ گھر پر تشریف لے آتے اور بڑے بھائی صاحبان اور یہ عاجز سب زنانے میں بیٹھ جاتے اور سہرا پڑھا اور سنا جاتا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ بھی جستہ جستہ پڑھتے رہتے اور مجھ سے بھی سنتے رہتے۔ کہیں کہیں طرز ادا اور لب و لہجے میں اصلاح بھی فرماتے۔ ۲۰ شعر تھے سہرے کے اگرچہ روزانہ یا ہر مجلس میں تو سب کے سب نہ پڑھے جاتے مگر بہر حال اس کی وجہ سے محفل شعر و سخن خوب گرم رہتی اور اس تقریب سے خواجہ صاحبؒ اپنا کلام سناتے رہتے۔ سہرا سنانے پر ایک شعر بھی فرمایا ؎

کچھ اس انداز سے گاتا ہے نجم الحسن سہرا

کہ سُننے کو ترستا ہے سُن کے مرا مِرا بن سہرا

ایک روز فرمانے لگے کہ آپ صرف سہرا ہی سنا سکتے ہیں یا دوسرے بحر کے اشعار بھی پڑھ لیتے ہیں۔ بھائی صاحب نے بتایا کہ یہ آپ کی ہر غزل کو آپ کے طرز سے پڑھ سکتا ہے۔ اس پر تو وہ بہت ہی خوش ہوئے اور اس کے بعد سے ہر مجلس میں سہرے کے ساتھ اپنے اشعار بھی ذوق و شوق سے سنتے رہتے اور سارا وقت اسی میں ختم ہو جاتا۔ ساتھ ساتھ خود بھی پڑھتے رہتے۔ سبحان اللہ! صاحب حال، صاحب ذوق، صاحب دل۔ سبھی کچھ تھے۔ ایک روز ظہیر علی مرحوم (میرے ماموں زاد بھائی) نے ایک غزل سنانے کی خواہش ظاہر کی کہ ؎

جی اٹھے مُردے تری آواز سے

اس فرمائش پر خواجہ صاحب کو بڑا تعجب ہوا کہ اس غزل کا ان کو کیسے علم ہوا؟ مگر ہمارے تو سارے گھرانے کو ان کے اشعار نوکِ زبان تھے اور سب ہی ان کے کلام کے دلدادہ تھے۔ سہرا لکھنے کے بعد خواجہ صاحب نے ایک مبارکبادی بھی لکھی جس میں نوشہ کو خطاب فرمایا۔

یہ اے نوشہ تجھے شادی مبارک ہو مبارک ہو
یہ قیدِ غم سے آزادی مبارک ہو مبارک ہو
دلہن لاتی ہے کتنا ساز و سامان شکر کر نوشہ
ترے گھر آئی شہزادی مبارک ہو مبارک ہو
وہ ڈولے سے جب اتری گھر کا گھر سب جگمگا اٹھا
تری تقدیر چمکا دی مبارک ہو مبارک ہو
جو ماموں بھی، خسر بھی، باپ بھی، مشفق بھی، محسن بھی
تجھے ایسے کی دامادی مبارک ہو مبارک ہو
تصور میں بھی جو تیرے نہ آتی تھی وہ خالق نے
تیرے پہلو میں بٹھلا دی مبارک ہو مبارک ہو

ہوا بھی جس حیا والی کی پانا غیر ممکن تھا
وہ حق نے گھر میں پہنچا دی مبارک ہو مبارک ہو

غم دوری نے ڈورے بیچ میں ڈالے بہت لیکن
بالآخر ہو گئی شادی مبارک ہو مبارک ہو

بہت درپے رہا پیر فلک لیکن بعون اللہ
چلی اس کی نہ استادی مبارک ہو مبارک ہو

تری قسمت سے ہے مجذوب بھی جذبے میں آج ایسا
کہ محفل اس نے گرما دی مبارک ہو مبارک ہو

شکر کر تو بھی تری قسمت بھی جاگ اٹھی
کہ تیسے ہوئی شادی مبارک ہو مبارک ہو

بڑی عزت تو یہ پائی کہ عالم کے گھر آئی
جو ہو گا حق کا ہادی مبارک ہو مبارک ہو

نسب دونوں کا ہے عالی وہ صدیقی ہے تو فاروقی
وہ شہزادہ تو شہزادی مبارک ہو مبارک ہو

تحکم کا نہیں عادی طبیعت اس کی ہے سادی
رہے گی خوب آزادی مبارک ہو مبارک ہو

تجھی کو مل گیا شوہر حلیم ایسا سلیم ایسا
سبھی ہیں ورنہ فریادی مبارک ہو مبارک ہو

اس مبارک بادی کے بھی غالباً ۹ اشعر تھے جس میں زیادہ تر دلہن کو سراہا ہے۔ کچھ روز بعد فرمایا کہ صاحب کہیں خدا نخواستہ دلہن کے دل میں عُجب پیدا نہ ہو جائے۔ اس لئے دلہن کو مخاطب کر کے فرمایا سے

خدا کی یہ بھی رحمت ہے کہ اک مجذوب کے منہ سے
دعا دونوں کو دلوا دی مبارک ہو مبارک ہو

کچھ روز تک اس مبارک بادی کا خوب چرچا رہا۔ سہرا لکھا گیا تھا والدہ کی فرمائش پر۔ اس لئے والدہ

صاحبہ نے شادی کے کچھ روز بعد ایک سینی میں امرتیاں لگا کر خواجہ صاحب کے گھر بھیج دیں۔ دوسرے روز خواجہ صاحب ایک کاغذ پر یہ قطعہ تحریر فرما کر دے گئے۔

سینی بھری جو گھر میرے بھیجیں امرتیاں — اتنی خوشی ہوئی کہ کروں اس کا کیا بیاں

میرے حقیر سہرے کی یہ قدر دانیاں — کہتا ہوا پھرتا ہوں گھر گھر یہاں وہاں

مجھ کو صلے میں سونے کے کنگن عطا ہوئے

اور ایک دو نہیں کئی درجن عطا ہوئے

ایک روز صبح صبح تشریف لائے۔ نماز فجر کا بعد کا تھا اور ہم سب بھائی سیر کو نکلے ہوئے تھے۔ اس لئے انتظار میں باہر تشریف فرما رہے۔ سخت سردی کا موسم تھا۔ رضائی اوڑھے کرسی پر سہرا گنگناتے رہے ماموں شبیر علی صاحب کے مکان سے نوکرانی کسی کام سے باہر آئی تو دیکھا کہ خواجہ صاحبؒ تشریف فرما ہیں اور اشعار گنگنا رہے ہیں۔ اندر جا کر بتایا تو ممانی صاحبہ نے ایک سینی میں ناشتہ لگا کر ان کے لئے بھیجا۔ خواجہ صاحبؒ نے ناشتہ کیا ہم لوگوں کو لوٹنے میں دیر ہوئی۔ اس لئے ناشتہ کر کے ناامید ہو کر واپس تشریف لے گئے۔ اور دس بجے کے قریب دوبارہ تشریف لائے۔ ہم سب حاضر ہوئے اور حسب معمول محفل شعر و سخن شروع ہوئی۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے ایک کاغذ پر یہ دو شعر لکھے ہوئے عنایت فرمائے کہ یہ مولوی شبیر علی صاحب کے گھر بھجوا دیجئے۔

دلہن کے در پہ سہرا میں نے اس انداز سے گایا

کہ فوراً گھر سے مجھ کو پُر تکلف ناشتہ آیا

مزے لے لے کے کھاتا ہوں دعائیں دیتا جاتا ہوں

خدا کا شکر ہے محنت کا ثمرہ میں نے بھر پایا

سردی کا موسم تو تھا ہی ایک روز رات کو ہم سب جمع تھے۔ سہرا سنایا جا رہا تھا۔ چائے نوشی ہو رہی تھی کہ ممانی صاحبہ موصوفہ نے دہکتی ہوئی انگیٹھی ہاتھ سینکنے کے لئے بھیج دی تاکہ سردی میں کمی ہو۔ خواجہ صاحب بہت محظوظ ہوئے اور بڑی قدر فرمائی اور یہ شعر کہے ۔۔۔

انگیٹھی تم نے انگاروں بھری کیوں ہائے بجھوا دی

دہکتی آگ سینے کی مرے اُف اور بھڑکا دی

کیا تھا کم بڑی مشکل سے جوشِ اشعار پڑھنے کا

میں ٹھنڈا پڑ گیا تھا پھر طبیعت میری گرما دی

اگلے روز تشریف لائے تو انگیٹھی کے یہ شعر کئی بار سنے اور فرمایا کہ صاحب انگیٹھی کے شعر بہت اچھے ہو گئے۔

ایک روز چائے پیش کی اس کی پیالیاں بہت پسند فرمائیں اور برابر تعریف بھی فرماتے رہے اور اٹھا اٹھا کر دیکھتے بھی رہے۔ اگلے روز ان پیالیوں کے حسن پر بھی شعر فرمائے۔ ؎

پیالی چائے کی اُف اُف ہیں یہ کیسی حسین دیکھو

حسین ہیں اور پھر اس پر ہیں کیسی نازنین دیکھو

بہت مجذوب کی ہیں جاذبِ حسن و جمال آنکھیں

نہ رکھ لے جائے آنکھوں ہی میں یہ انکو کہیں دیکھو

ایک روز چائے پر علاوہ متفرق چیزوں کے میاں ظہیر علی مرحوم (میرے ماموں زاد بھائی) نے ایک پلیٹ میں مصنوعی پھل، جو مٹی کے بنے ہوتے ہیں اور رنگ و روغن اس طرح کیا جاتا ہے کہ بالکل اصلی ہی معلوم ہوتے ہیں، بھی لا رکھے۔ رات کا وقت ہونے کے باوجود خواجہ صاحب رح نے ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور دیکھ کر بہت ہی خوش ہوئے۔ ایک ایک چیز کو بار بار اٹھا کر دیکھتے اور تعریف فرماتے۔ اگلے روز اس پر بھی دو شعر فرمائے ؎

ذرا چشمِ حقیقت بین سے تو دیکھو ظہیر ان کو

جو تم لائے ہو سیب، اخروٹ اور بادام مصنوعی

نہ سمجھو کھیل ان کو یہ سبق آموز عبرت ہیں

اسی صورت سے اس دنیا کا ہے ہر کام مصنوعی

ظہیر علی مرحوم نے ہوائی بندوق سے خواجہ صاحبؒ کے سامنے ایک فاختہ پر نشانہ باندھا۔ اور نشانہ بالکل صحیح لگا فاختہ گری اور ذبح کرلی گئی۔ اس پر بھی ایک شعر فرمایا ؎

ظہیر ایسا شکاری ہے کہ دم میں فاختہ ماری
بڑی پھرتی سے ماری اور بہت بے ساختہ ماری

ظہیر علی مرحوم کے چھوٹے بھائی شبیر علی سلمہٗ، جو اس وقت ڈیڑھ دو سال کی عمر کے غیر معمولی طور پر صحت مند اور فربہ تھے، اکثر کسی کی گود میں آتے اور خواجہ صاحبؒ بھی ان سے کھیلتے۔ ان پر بھی ایک شعر فرمایا کہ ؎

ترے گال کیا ہیں ڈبل روٹیاں ہیں
نہیں کوئی بڑی فقط پوٹیاں ہیں!

میرے بڑے بہنوئی محمد کاظم صاحب فاروقی (جن کا ذکر پہلے بھی آیا ہے) کی بڑی بچی اس وقت چار پانچ سال کی تھی۔ طبیعت کی بہت ہی سنجیدہ اور شرمیلی۔ کبھی کبھی باہر آجاتی تو خواجہ صاحبؒ اس کو گود میں بٹھا لیتے اور بہت محبت و شفقت فرماتے اور ایک روز فرمایا کہ یہ ہماری بیٹی ہے ماشاء اللہ بہت ہی سنجیدہ اور بہت خوبیوں کی بچی ہے۔ پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے، بھائی صاحب نے بتایا کہ "نجمہ خورشید نگین" سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ یہ نام شعر میں لانا کٹھن ہے۔ مگر دوسرے روز یہ دو شعر لکھ کر لائے ؎

بیٹی ہے مری نجمہ خورشید نگیں ایسی
دیکھی نہ حسیں ایسی، دیکھی نہ متیں ایسی
اس شان کی لڑکی کو تو اس کی ضرورت ہے
نکلے نہ کبھی باہر، ہو پردہ نشیں ایسی

اس بچی نے ایک روز پان کی تھالی لاکر پیش کی۔ پان کے بیڑے بنے ہوئے تھے۔ اور چاندی کے ورق میں لپٹے ہوئے۔ بچی کے ہاتھوں میں مہندی بھی لگی ہوئی تھی لاکر شرماتے شرماتے

اس نے پیش کیے۔ خواجہ صاحب نے پان کی تھالی لے کر رکھ لی اور اس کو گود میں بٹھا لیا۔ اور شفقت سے باتیں کرتے رہے۔ پھر پان تناول فرمایا۔ اور بہت ہی قدر کے ساتھ اس کی تعریف فرماتے رہے بعد میں اس پر بھی دو شعر ہوئے ؎

یہ چاندی کا ورق لپٹا ہوا مجھ کو جو پان آیا
تو گویا پاس اک بڈھے کے بن ٹھن کر جوان آیا
دیا دستِ حنائی سے جو تجھ نے تو میں سمجھا
کہ مجھ کو نقرئی پان اور زریں پان دان آیا

بھائی شمس الحسن صاحب مدظلہ نے ایک روز خواجہ صاحبؒ کی دعوت کی اور کئی قسم کے پر تکلف کھانے پکوائے۔ کھانے کے بعد مجلسِ شعر و سخن دیر تک رہی۔ اس دعوت کے بعد یہ شعر فرمائے ؎

خبر کیا تھی مجھے نوشہ! کہ اک بہرے کے لکھنے سے
میرے پیچھے ہی پڑ جائے گا سارا خاندان ایسا
کر دئے مجذوب کیا مجذوب کا تم لوگ مل جل کر
جو لائے خوان ایسا، پان ایسا، پاندان ایسا

اسی طرح یہ وقت "ہر روز، روزِ عید اور ہر شب شبِ برأت" کی طرح گزرتا رہا۔ تقریباً ہر روز کا معمول بنا ہوا ہے کہ گھر پر یا پھر اس طرح کہ بعد عصر، سیر کے لئے قصبے سے باہر نکل کر اور راستے میں بھی اور وہاں پہنچ کر بھی کسی جگہ بیٹھ کر محفل شعر و سخن گرم رہتی جس میں زیادہ تر ایسا ہوتا کہ خواجہ صاحبؒ مجھ سے اپنا کلام سنتے اور محظوظ ہوتے۔ ایک روز اسی طرح ہم سب باہر نکلے اور ایک جگہ پہنچ کر ایک پانی کے کھال پر جو پل بنا ہوا تھا اس کی دو طرفہ منڈیروں پہ آمنے سامنے سب بیٹھ گئے۔ اتفاق سے میرے سامنے خواجہ صاحبؒ اور ان کے سامنے میں تھا۔ اس زمانے میں خواجہ صاحبؒ کی ایک غزل، بہت پڑھی اور سنی جا رہی تھی۔ یہ وہی غزل تھی جس کی فرمائش ابتداً

ظہیر علی مرحوم نے کی تھی۔ چنانچہ خواجہ صاحبؒ نے اسی کی فرمائش کی اور احقر سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

؎ تو ہے مطرب اور میں تیرا ساز ہوں
تو زباں ہے میں تری آواز ہوں

یہ شعر بہت پسند کیا گیا اور بار بار پہلے بھی سنا گیا۔ غزل کچھ کی فرمائش کی گئی تھی، چند شعر یاد ہیں ؎

جی اُٹھے مُردے تری آواز سے
پھر ذرا مطرب اسی انداز سے
اہلِ محفل فرشِ محفل ہو گئے
بزم میں آئے وہ کس اس انداز سے
اک نظر میں آشیاں گم کردہ کو
بھانپ لیں ہم ہیئت پرداز سے
آشنا بیٹھا ہو یا نا آشنا
ہم کو مطلب اپنے سوز و ساز سے
آشنا اچھا ہے یا نا آشنا
پوچھیئے یہ آشنائے راز سے

اسی غزل میں ایک شعر مذاحیہ فرمایا ؎

میں ہوں لانبے قد کا وہ ہیں پستہ قد
جوڑ سارس کا ملا ہے قاز سے

یہ وقت اپنی پوری رعنائی اور پرکشش رونقوں کے ساتھ سراپا بہار کی طرح گزرتا چلا گیا اور پورے ڈیڑھ سال بعد ظہیر علی مرحوم صرف تین چار روز بستر علالت پر رہ کر ہم سب کو داغ مفارقت دے گیا۔ اور اس کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد اس کی بہن بھی چند روز بیمار رہ کر داغ مفارقت دے

گئیں۔ دونوں گھروں میں ان دونوں جواں سال اموات سے جو کچھ گزری۔ اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کجا یہ کہ اس کو الفاظ کا جامہ پہنایا جا سکے۔ سارے ہی قصبہ میں ایک سناٹا سا چھا گیا اور ساری فضا سوگوار ہو گئی۔ آنسوؤں کا نہ تھمنے والا سیلاب اور غم کا نہ رکنے والا طوفان تھا اور ہم تھے چاند اور ستارے بھی بے نور نظر آتے تھے اور بڑے بڑے پرکشش، پُر بہار اور پُر رونق مناظر بھی خزاں کا اور ویرانے کا منظر پیش کرتے تھے ؎

ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے
چاند تاروں میں روشنی کم ہے

اور ؎

دل گلستاں تھا تو ہر شئے سے ٹپکتی تھی بہار
یہ بیاباں جب ہوا عالم بیاباں ہو گیا

اور ؎

ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اس عظیم پریشانی اور مصیبت کے وقت بحمد اللہ ایمان کی دولت کی قدر ہوئی کہ یہی ٹھارس بنا رہا اور خالقِ حقیقی سے رشتہ قائم رہا۔ جس کی وجہ سے ان مصیبتوں کے ساتھ ساتھ دل میں ایک خاموش سکون، اطمینان، اور تسلی موجود تھی۔ اس حادثے کی وجہ سے زندگی بُری طرح متاثر ہوئی، چنانچہ مجالس شعر و سخن کی جگہ مجالس تعزیت اور مجالس حزن و ملال رہ گئیں اور گذشتہ رونقیں اور مجلسیں ختم ہو گئیں۔ اس کے بعد قریب دنوں ہی میں خواجہ صاحبؒ اپنی تین سال کی رخصت گزار کر واپس تشریف لے گئے۔ دونوں بڑے بھائی صاحبان تعلیم کی تکمیل کر ہی چکے تھے۔ اس لئے روزگار کے سلسلہ میں وطن سے باہر چلے گئے۔ چند سال بعد مجھے بھی بعد تکمیل باہر جانا پڑا۔ اور اس طرح ہم تینوں بھائی لاہور پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک دفعہ ایک سلسلہ میں بڑے بھائی صاحب نے

حضرت خواجہ صاحبؒ کو ایک خط لکھا جس کا چند روز کے بعد جواب آیا۔ آخر میں تحریر تھا کہ "آپ لوگ کہاں چلے گئے؟ بہر حال ہر کجا باشی باخدا باش۔" اس کے بعد دعا و سلام کے بعد خط ختم فرمایا اور نام کی جگہ یہ شعر تحریر فرمایا ؎

وہی آپ کا ہوں غلام محبت
کہ مجذوبؔ ہے جس کا نام محبت

مجھے لاہور آئے ہوئے ایک ڈیڑھ سال ہی کا عرصہ ہوا تھا کہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ کی وفات ہوگئی۔ اس کی خبر ہم لوگوں کو لاہور ہی میں ملی۔ اور ہم تینوں فوری طور پر تھانہ بھون روانہ ہوگئے۔ وہاں پہنچے تو خزاں کا عالم تھا۔ چمن اجڑ چکا تھا۔ اور ہر طرف اداسی اور ویرانی نے ڈیرے جما رکھے تھے۔ ہر شخص غمزدہ، اداس، دلگیر اور بجھا ہوا تھا اور ساری فضا غم و اندوہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ خواجہ صاحبؒ بھی وہیں تھے۔ جو اب ریٹائر ہو چکے تھے اور حضرت قدس سرہٗ کی طویل علالت کی وجہ سے عرصہ سے وہیں قیام فرما تھے۔ ان سے ملاقات ہوئی کئی سال بعد ملے اور اس حال میں کہ دل و جگر غم سے لبریز اور روح رنج و الم سے مضمحل۔ بس ہر وقت اسی آفتاب ہدایت اور مرکز خلائق کی باتیں تھیں اور انہی کا تذکرہ تھا۔ اب شعر و شاعری کا موضوع بھی یہی تھا۔ ایک روز کھانے پر فرمایا کہ ؎

کہاں یہ خوش رنگ تیلیاں اور کہاں وہ بدرنگ خشک تنکے
گو نفس پھر اُف قفس ہے اور آشیاں پھر بھی آشیاں ہے
فنا اسے کر سکے بھلا، یہ اجل کی بھی دسترس کہاں ہے
وہ غیر منفک جو ایک ربطِ خفی مرے ان کے درمیاں ہے

اور اسی قسم کے اشعار سناتے رہے۔ اس زمانے میں ان کی حالت چند سال قبل کی حالت سے بالکل مختلف تھی۔ بس ایک بے چینی سی اور بے قراری سی پائی جاتی تھی۔ ہر وقت یہی ذکر رہا کرتا تھا۔ حضرت قدس کی ذات والا صفات، خانقاہ اور ان بزرگوں کے واقعات و تذکرے جو خانقاہ سے وابستہ ہیں۔ حضرت قدس سرہٗ جس جگہ خانقاہ میں تشریف فرما ہوا کرتے تھے وہ ایک سہ دری تھی۔ اسی سہ دری میں

چشمہ فیض کے وہ سوتے جاری تھے جنہوں نے چار دانگ عالم کو سیراب کیا ۔ خواجہ صاحبؒ اس دری کے بارے میں فرماتے ہیں ؎

اس سہ دری اشرف فردوس مکاں میں
جب آئے زیارت کو تو باچشمِ تر آئے
جو بزم بھری رہتی تھی مستانِ خدا سے
خالی وہ نظر آئے تو کیوں جی نہ بھر آئے

دراصل یہ شعر انہوں نے اپنی ایک پرانی غزل میں نئے اضافہ فرمائے ۔ فرماتے تھے کہ جب میں نے اپنا مکان بنوایا تو ایک کمرہ خاص اپنے لئے رکھا ہے اور اس کا نام "کاشانۂ مجذوب" رکھا ہے ۔ اس کمرے پر یہ قطعہ لکھوا کر لگاؤں گا ؎

کاشانۂ مجذوب ہے منزل گہِ مستاں
جو کوئی یہاں آئے سمجھ سوچ کر آئے
فرزانہ جسے بننا ہو جائے وہ کہیں اور
دیوانہ جسے بننا ہو، بس وہ اِدھر آئے
سَو بار بگڑنا جسے منظور ہو اپنا
وہ آئے یہاں، اور بچشمِ دگر آئے

اور فرمایا کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ایک مرید کی والدہ نے شکایت کی کہ آپ نے میرے لڑکے کو بگاڑ دیا ۔ تو حضرت نے فرمایا کہ ہاں بھئی ہم تو بگاڑتے ہی ہیں جس کو سو دفعہ بگڑنا منظور ہو وہ ہمارے پاس آئے اور جس کو سنورنا ہو وہ کہیں اور چلا جائے ۔

ایک روز بڑے سوز و گداز سے یہ شعر پڑھے ؎

ڈھونڈتا ہے دل وہی کیف آفریں ماحول پھر
وہ بہاریں ہیں کہاں جو آہ میخانے میں تھیں

مستیاں ہر سو برستی تھیں در و دیوار سے
اور وہاں کیفیتیں سو خم کی پیمانے میں تھیں

ایک روز صبح ناشتے کے بعد حاضر ہوا. ایک قطعہ سنایا ۔

مخمورِ یادِ یار ہیں اوقات آج کل ۔ ڈوبے ہوئے ہیں کیف میں دن رات آجکل
فیضِ یقیں سے قلب ہے محوِ مشاہدہ ۔ وسواس ان دنوں ہیں نہ شبہات آجکل

کیف لے لے کر دیر تک اسی قطعے کو سناتے رہے. اور پھر اسی سلسلے میں اور قطعات سنائے ۔

مجذوب کو کہاں تھا یہ احساسِ زندگی ۔ کچھ ہوش میں ہے کیا ترا دیوانہ آج کل
وحشت ہے گھر سے انس ہے صحرا سے ان دنوں ۔ یکساں نہیں ہیں خانہ و ویرانہ آج کل

ساری فضائے دہر ہے مستانہ آجکل ۔ دورِ فلک ہے گردشِ پیمانہ آجکل
ہر شئے میں کیف ہے جو طبیعت میں کیف ہے ۔ سارا جہاں نظر میں ہے مےخانہ آجکل

فطرت ہے مست روح ہے مستانہ آجکل ۔ شیشہ ہے قلب، دیدہ ہے پیمانہ آجکل
دورانِ خوں میں کیف ہے دورِ شراب کا ۔ مجذوب اپنا آپ ہے میخانہ آجکل

مسجد بھی ہے نگاہ میں میخانہ آجکل ۔ تسبیح بھی ہے گردشِ پیمانہ آجکل
اللہ رے جوشِ مستیِ مجذوب ان دنوں ۔ دیوانہ ہو رہا ہے یہ مستانہ آجکل

انوارِ مے سے دل ہے پری خانہ آجکل ۔ صد شمع در بغل ہے یہ پروانہ آجکل
جاذب ہزار حسن ہو اٹھتی نہیں نظر ۔ مجذوب ہر حسیں سے ہے بیگانہ آجکل

یہ قطعات دراصل خواجہ صاحبؒ کے اپنے حال اور کیف کی ترجمانی تھے، وہ عرفان و مشاہدہ کے جس مقام پر تھے، یہ اسی کی ترجمانی تھی۔ اسی سلسلے کی کڑی کے چند اور قطعات یاد آتے ہیں ؎

تم سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے
ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے

اب اور کچھ ہے میرے دن رات کا عالم ہر وقت ہے اب ان سے مناجات کا عالم
اب دل میں شب و روز جو ہے ان کا تصور فرقت میں بھی رہتا ہے ملاقات کا عالم

جلاکردۂ دستِ دلدادہ ہوں میں مجھے دیکھ آئینہ یار ہوں میں
سنوارا ہے کس درجہ بگڑے ہوئے کو سیہ دل تھا یا اب پُر انوار ہوں میں

انہی قطعات کے سلسلے میں حضرت خواجہ صاحبؒ نے وہ قطعات بھی تحریر فرمائے جو اپنے شیخؒ کی تعلیمات پر مشتمل ہیں اور اصلاحِ نفس کے آسان طریقے ان میں درج ہیں۔ یہ قطعات بڑے ہی مؤثر، دلنشیں اور دل میں گھر کرنے والے ہیں، چند قطعے تحریر کرنا لابدی ہے تاکہ نمونہ از خروارے کا مصداق ہو ؎

تجھ کو جو چلنا طریقِ عشق میں دشوار ہے تو ہی ہمت ہار ہے ہاں تو ہی ہمت ہار ہے
تو جو راہبر دہر قدم پر کھا رہا ہے ٹھوکریں لنگ خود تجھ میں ہے ورنہ راستہ ہموار ہے

راہبر تو بس دکھا دیتا ہے راہ راہ چلنا راہرو کا کام ہے
تجھ کو راہبر لے چلے گا دوش پر یہ ترا اے راہرو خیالِ خام ہے

سوچ ماضی کو نہ اِستقبال کو — ٹھیک رکھ بس تو تو اپنے حال کو
کیا ہُوا؟ کیا ہو گا؟ اس غم میں نہ پڑ — پاس لا اپنے نہ اِس جنجال کو

رہِ عشق میں ہے تگ و دو ضروری — کہ یوں تا بمنزل رسائی نہ ہو گی
پہنچنے میں گو ہو گی حد درجہ کلفت — تو راحت بھی کیا انتہائی نہ ہو گی

"مترس از بلائے کہ شب درمیان ست" — یہ کہہ کر نہ سو شب بھر آرام ہی سے
ارے کوچ گو صبح ہونے پہ ہو گا — مگر فکرِ توشہ تو کر شام ہی سے

کسب دنیا تو کر، ہوس کم رکھ — اس پہ تو دین کو مقدم رکھ
دینے لگتا ہے پھر دھواں یہ چراغ — اِک ذرا اِس کی لَو کو مدّھم رکھ

طبیعت کی رَو زور پر ہے تو رُک — وگرنہ یہ حد سے گزر جائے گی
ہٹا لے خیال اس سے کچھ دیر کو — چڑھی ہے یہ ندی اتر جائے گی

حضرت خواجہ صاحبؒ بہت بڑے شاعر، عارف، صوفی، بزرگ اور خدارسیدہ ہونے کے علاوہ، بے حد متواضع، منکسرالمزاج، حلیم الطبع، ہنس مکھ، خوش مزاج اور بے تکلف فطرت کے مالک تھے۔ جس نے ایک دفعہ ان کی مجلس میں حاضری دی وہ عمر بھر کے لئے ان کا گرویدہ ہو گیا۔ ان کے دوستوں میں سے کسی نے ان کی بعض باتوں پر گرفت کی، اور ان باتوں کو ان کی شان کے خلاف قرار دیا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ کی ذات بابرکات ان چیزوں سے بلند و بالا تھی کہ وہ تصنع اور تکلف سے بظاہر پُروقار اور پُررعب رہیں۔ اس لئے ان کو جواب میں لکھ بھیجا ہے کہ ؎

یہ قرب مبارک ہو تجھے صوفیٔ صافی — مجذوب کو اک دور کی نسبت بھی ہے کافی

اس رند کے حق میں یہ دعا کرے خدا را — توفیق ندامت سے ہو غفلت کی تلافی !

بخشے تجھے اللہ بلندیِ مراتب

مجھ کو ہو عطا میرے گناہوں کی معافی

ایک روز اپنی غزل سنا رہے تھے اس میں بھی اس مضمون کو بیان فرمایا۔ غزل کے چند شعر یاد ہیں ؎

پسِ پردہ تجھے ہر بزم میں شامل سمجھتے ہیں

کوئی محفل ہو' اس کو ہم تری محفل سمجھتے ہیں

سمجھتا ہے غلط لیلیٰ کو لیلےٰ' قیسِ دیوانہ

نظر والے تو لیلےٰ' ہی کو اک محمل سمجھتے ہیں

سمجھتا ہے گنہ رندی کو تو اے زاہد خود بیں

اور ایسے زہد کو ہم کفر میں شامل سمجھتے ہیں

حضرت تھانوی قدس سرہ کی وفات حسرت آیات کے بعد قیام تھانہ بھون کے زمانے میں دہلی میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ اس کے ناظم آزاد صاحب نے' جو خواجہ صاحبؒ کے بے تکلف دوست اور بلند پایہ شاعر تھے، مشاعرہ میں شرکت کے لئے دعوت نامہ بھیجا اور خصوصی خط تحریر کیا کہ ضرور آیئے خواجہ صاحب نے عذر لکھ بھیجا کہ اب طبیعت میں ان مجالس کی طرف نہ رغبت ہے اور نہ ہمت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے پھر اصرار کا خط لکھا۔ کہ یہ مشاعرہ عام مشاعروں کی طرح نہیں ہے بلکہ اس میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی شعراء حصہ لیں گے جن کا ذوق اور بلندی مسلمہ ہے۔ اس لئے آپ کی شرکت کے بغیر یہ نامکمل رہے گا۔ اور آپ کو جن وجوہ سے کچھ ہچکچاہٹ اور تامل ہے وہ مؤثر نہیں ہوں گے۔ اس لئے آپ ضرور تشریف لایئے۔ خواجہ صاحبؒ نے جواب میں یہ قطعہ لکھ بھیجا۔

چھوڑ مینا و جام کی باتیں — اب ہوں پیری میں کام کی باتیں

دن کی باتوں کا اب یہ وقت نہیں   شام ہے اب ہوں شام کی باتیں

آزاد صاحب بھی شاعر تھے۔ انہوں نے جواب میں پھر اصرار کا ایک لمبا چوڑا خط لکھا اور اسی زمین میں ایک طویل نظم تحریر کی جس کی ایک جھلک یہ ہے ؂

کیوں ہوں مینا و جام کی باتیں   کیجئے آ کے کام کی باتیں!
آیئے لوگ سننا چاہتے ہیں   ایک شیریں کلام کی باتیں
آپ بزم عوام میں آ کر   کیجئے اپنے مقام کی باتیں

مگر بہر حال خواجہ صاحبؒ دہلی کے اس مشاعرے میں تشریف نہیں لے جا سکے۔

خواجہ صاحبؒ اپنا کلام سناتے اور سنتے رہے۔ اور خواہش ظاہر فرمائی کہ میں اب واپس وطن جانے والا ہوں۔ اگر آپ (یعنی راقم) میرے ساتھ چلیں اور دو چار چھ مہینے میرے پاس رہیں تو میں اپنا دیوان آپ سے مرتب کرا کے آپ کو دے دوں۔ ورنہ یہ کام ہو نہیں سکے گا لیکن مجھے انہی دنوں لاہور پہنچنا ضروری تھا۔ اس لئے یہ کام نہ ہو سکا۔ اس سلسلے میں فرمایا کہ دیوان مرتب ہو جائے تو اس کا نام اس طرح رکھا جائے گا۔

کہ پہلی سطر میں "کلامِ مجذوب" لکھا جائے پھر اس کے نیچے "ملقب بہ" خفی قلم سے لکھا جائے اور جلی قلم سے "پیامِ محبت" اور سب سے اوپر یہ شعر لکھا جائے ؂

کلامِ مجذوب والہانہ، ہمیشہ دہرائے گا زمانہ
کسی حسیں کا نہیں فسانہ، یہ ایک عاشق کی داستان ہے

اور نیچے یہ شعر ہوگا ؂

جو مجذوب کا ہے کلامِ محبت   وہ دنیا کو ہے اک پیامِ محبت

ایک روز شعر و سخن کی مجلس خاصی طویل ہوگئی اور یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بلکہ خواجہ صاحبؒ کے ساتھ بیٹھ کر پھر اہلِ مجلس کو وقت کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہوا تو فرمایا کہ ؂

بڑے استاد نہ تم مجذوب کی   پھر یہ سن پاؤ گے افسانہ کہاں

کر رہا فاش راز حسن و عشق پھر ملے گا ایسا دیوانہ کہاں

یہی قطعہ بار بار پڑھتے اور سنتے رہے اور پھر فرمایا ۔

یہ تپش یہ تفتہ جانی پھر کہاں سُن لو یہ آتش بیانی پھر کہاں

پھر کہاں مجذوب کی یہ شورشیں یہ طبیعت کی روانی پھر کہاں

ایک روز احقر کے ساتھ میرے ایک قریبی عزیز جو عالم و فاضل ہیں، دوسرے حضرات کے ساتھ حضرت خواجہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ خواجہ صاحبؒ اپنے طرز میں ترنم سے پڑھ رہے تھے۔ احقر بھی اسی طرز میں پڑھنے کی کوشش کرتا۔ کہ اِن صاحب نے اپنے انداز سے بلا کے سوز و ترنم سے پڑھا۔ جس کو سُن کر سب بے حد محظوظ ہوئے۔ خواجہ صاحبؒ تو والہانہ سُن رہے تھے۔ خواجہ صاحبؒ نے ان سے دوبارہ سنانے کی فرمائش کی۔ مگر وہ صاحب کئی روز خواجہ صاحبؒ سے مصر تھے کہ آپ دہلی میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں۔ خواجہ صاحبؒ انکار فرمارہے تھے۔ اب جب دوبارہ پڑھنے کی فرمائش ہوئی تو ان صاحب نے کہا کہ میں اِس شرط پر پڑھوں گا کہ آپ دہلی چلنے کا وعدہ فرمائیں۔ خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ وعدہ تو جب تک چلنے کا قصد نہ ہوگا۔ نہ کروں گا۔ خواجہ صاحبؒ کے بار بار اور بہت زیادہ اصرار پر بھی انہوں نے نہ سنایا۔ آخر کار مجبور ہو کر پھر احقر سے فرمائش کی کہ اچھا صاحب! آپ ہی سنائیے۔ چنانچہ احقر نے سنایا مگر اِس دفعہ ان صاحب کی طرز میں سنانے کی کوشش کی۔ اللہ اللہ! سن کر خواجہ صاحبؒ نے اس قدر قدردانی فرمائی کہ احقر بھی حیراں رہ گیا۔ پھر تو بار بار احقر سے سنتے رہے۔ اور دیر تک یہ محفل جمی رہی۔

یہ وقت بھی گزر گیا۔ احقر لاہور اور خواجہ صاحبؒ اپنے وطن چلے گئے۔ چند ماہ بعد پھر تھانہ بھون جانا ہوا تو دیکھا کہ خواجہ صاحب بھی خانقاہ میں تشریف فرما ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ فرمانے لگے کہ اب جب سے پنشن ہوئی ہے۔ بڑا آرام ہے ۔

جو پنشن ہو گئی ہے اب تو واہ کیا بات ہے اپنی

سحر اپنی ہے شام اپنی ہے دن اپنا ہے رات اپنی

معلوم ہوا کہ خواجہ صاحبؒ عنقریب خانقاہ سے ایک سفر شروع فرمائیں گے جس کا مقصد اپنے پیر بھائیوں سے ملنا اور ملاقات کرنا ہوگا۔ احقر کا قیام چند روز تھا اس لئے کوشش یہی کرتا کہ زیادہ سے زیادہ وقت ان کے ساتھ گزاروں۔ بالآخر وہ دن بھی آ پہنچا کہ جس روز مجھے ظہر کی نماز کے بعد گاڑی سے روانہ ہو جانا تھا۔ اس لئے میں نے خیال کیا کہ نماز کے بعد خدا جانے ملنا ہو سکے یا نہ ہو سکے، اس لئے ناشتہ کر کے تقریباً آٹھ بجے صبح خانقاہ حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آج جانا ہے۔ رخصت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ دیگر حضرات بھی تشریف فرما تھے۔ مجھے اپنے بہت ہی نزدیک بٹھا لیا۔ اور اپنے اشعار، قطعات اور غزلیں سنتے رہے اور سناتے رہے، تقریباً گیارہ بجے اسی قطعے کو سننے کی فرمائش کی جس کا ذکر ابھی گذرا۔ احقر نے تعمیل کی۔ پھر فرمائش کی پھر تعمیل کی۔ کبھی خود پڑھتے کبھی مجھ سے پڑھواتے۔ قطعہ ان کے حسبِ حال تھا۔ اس لئے سُن کر اور پڑھ کر کسی طرح اُن کا جی نہ بھرتا تھا۔ فرمانے لگے کہ صاحب! اب تو دل چاہتا ہے کہ درد دیوار سے اللہ اللہ نکلے۔ ساڑھے بارہ بجے کے قریب یہ محفل برخاست ہوئی۔ جب میں اُٹھ کر آنے لگا تو چند نصیحتیں بڑے دل سوز انداز میں فرمائیں اور رخصت کیا۔ قطعہ جو زیادہ سنا گیا وہ یہ ہے ؎

مجھے دوست چھوڑ دیں سب، کوئی مہرباں نہ پوچھے
مجھے میرا رب ہے کافی مجھے کل جہاں نہ پوچھے
شب و روز میں ہوں مجذوب اور یاد اپنے رب کی
مجھے کوئی ہاں نہ پوچھے، مجھے کوئی ہاں نہ پوچھے

اور احقر کی ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ احقر لاہور آ گیا اور وہ ایک آدھ روز کے بعد اپنے مجوزہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ سب سے پہلے امرتسر حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے۔ اور چند روز قیام کے بعد بیمار ہوئے اور بیماری کی شدت کے باعث وطن واپس تشریف لے گئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہ رَاجِعُون۔

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ، خواجہ صاحبؒ کا ذکر ہمیشہ اس انداز سے فرماتے کہ ان کو اپنا مقتدا سمجھتے ہوں۔ ان کے اشعار اپنے وعظ میں بڑے جوش و خروش سے نقل فرماتے۔ ایک دفعہ فرمایا کہ جب امرتسر تشریف لائے اور بیمار پڑ گئے تو عبید اللہ عیادت کے لئے حاضر ہوا۔ تو فرمایا کہ دیکھو لوگ میری طرف کیسے کھنچے آتے ہیں اور کتنا احترام کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو یہ شبہ ہے کہ میں دیندار ہوں۔ حالانکہ میں نے دینداروں کا محض بھیس بنا رکھا ہے۔ سو اگر اس میں حقیقت ہو اور واقع میں انسان دیندار بن جائے تو پھر اس کی کیسی کچھ قدر ہو۔ آخرت تو درست ہو ہی گی مگر دنیا میں بھی عزت و احترام دین ہی کے صدقے ملتا ہے۔

ایک دفعہ فرمایا کہ میں تھانہ بھون خانقاہ کے جس حجرے میں مقیم تھا، اس کے دروازے پر ایک روز خواجہ صاحبؒ آئے۔ اور چوکھٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ باتیں کرنے لگے۔ میں نے کہا کہ خواجہ صاحبؒ! یہ شعر تو آپ نے جیسے میرے ہی لئے کہا ہے ؎

میں بدی میں آپ ہوں اپنی مثال

بدعمل، بدنفس، بدخُو، بدخصال

خواجہ صاحبؒ نے فرمایا کہ شعر تو میں نے اپنے ہی لئے کہا ہے اگر کوئی اپنے اوپر چپکائے تو چپکاتا پھرے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اپنے مواعظ میں حضرت خواجہ صاحبؒ کے جو اشعار پڑھا کرتے تھے ان میں زیادہ تر "مراقبہ موت" کے اشعار تھے۔ مثلاً ؎

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم　　　چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بدم

سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم　　　دفعتہً اک روز یہ جائے گا تھم!

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے

کر لے جو کرنا ہے آخر موت ہے

دارِ دنیا کی سجاوٹ پر نہ جا　　　نیکیوں سے اپنا اصلی گھر سجا

پھر وہاں بس بین کی میں بجب   اِنَّہٗ قَدْ فَازَ فَوْزًا مَنْ نَجَبْ!

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

بہرِ غفلت یہ تیری ہستی نہیں   دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں
رہ گذر دنیا ہے یہ بستی نہیں   جائے عیش و عشرت و مستی نہیں

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

گرتا ہے دنیا پہ تو پروانہ دار   گو تجھے جلنا پڑے انجامِ کار
اس پہ دعویٰ ہے کہ ہم ہیں ہوشیار   کیا یہی ہے ہوشیاروں کا شعار؟

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

حیف دنیا کا تو ہو پروانہ تُو !   اور کرے عقبیٰ کی کچھ پرواہ، نہ تُو
اس پہ بنتا ہے بڑا فرزانہ تُو   کس قدر ہے عقل سے بیگانہ تُو

ایک دن مرنا ہے آخر موت ہے
کرلے جو کرنا ہے آخر موت ہے

خواجہ صاحبؒ کا قول نقل فرماتے کہ سامنے دیوار ہے جو بے جان ہے جب سے بنی ہے اور جب تک قائم رہے گی اس میں کوئی گناہ کرنے کا تقاضا پیدا نہ ہوگا۔ مگر اس دیوار کو خدائے تعالیٰ کے یہاں کوئی درجہ نہ ملے گا۔ درجات تو انسان کے لئے ہیں کہ اس میں گناہ کرنے کا تقاضا پیدا ہوتا ہے تو وہ اس کا مقابلہ کرتا ہے اور اس مقابلے میں ہوتی ہے مشقت۔ بس اسی مشقت کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے ہاں درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی کسی گناہ کا تقاضا دل میں پیدا ہو تو انسان بھانپ جائے کہ اب لُوٹ کا اور کمائی کا وقت ہے یعنی اس گناہ سے

بچے اور خدا تعالیٰ کے ہاں اپنے درجات بڑھائے ؎

ہے شوق و ضبطِ شوق میں دن رات کش مکش

دل مجھ کو، میں ہوں دل کو پریشاں کئے ہوئے

خواجہ صاحبؒ کے حوالہ سے حضرت مفتی صاحبؒ نے یہ واقعہ بھی بیان فرمایا کہ ایک دفعہ لکھنؤ میں تھے۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا چونکہ خواجہ صاحب انسپکٹر آف سکولز تھے۔ اس لئے وہاں کے سربراہ محکمہ نے جو کہ ہندو تھا۔ میٹنگ رکھ لی۔ اور وقت میٹنگ کا شام کا رکھا گیا۔ اس میں خواجہ صاحبؒ کو بھی شرکت کرنا تھی اور بلا واضروری تھا۔ فرماتے تھے کہ میں پریشان ہوا اور شش و پنج میں پڑ گیا کہ اگر جاتا ہوں تو مغرب کی نماز باجماعت اور بعد کی نوافل وغیرہ جاتی ہیں۔ نہیں جاتا تو ملازمت کا معاملہ ہے۔ اسی پریشانی میں دن گزرا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ نماز پڑھ کر معمولات پورے کر کے ہی جاؤں گا۔ چنانچہ نہایت اطمینان سے سارے کاموں سے فارغ ہو کر پہنچا۔ راستہ میں طرح طرح کے خیالات تنگ کرتے رہے۔ وہاں جا کر دیکھا تو میٹنگ شروع تھی اور ایک صاحب تقریر کر رہے تھے۔ میرے پہنچنے پر سربراہ نے کھڑے ہو کر میرا استقبال کیا۔ اس لئے سب کو کھڑا ہونا پڑا اور کارروائی رک گئی۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور بتایا کہ اجلاس فلاں وقت شروع ہوا اور پہلے فلاں صاحب نے یہ یہ باتیں کہیں۔ اس کے بعد فلاں صاحب نے یہ یہ کہا، اب یہ صاحب بول رہے ہیں، انہوں نے یہ کہا اور یہ کہا۔ پھر ان صاحب سے خطاب کر کے کہا کہ اب آپ آگے فرمایئے۔

ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحبؒ کو ان کے شیخؒ نے سخت تنبیہ فرمائی اور خانقاہ سے نکل جانے کا حکم فرمایا۔ خانقاہ سے نکل کر قصبے ہی میں کسی جگہ رہے اور معافی کے لئے خط و کتابت فرمائی اس میں فرمایا ؎

مجھ کو نکال بھی دیا تب بھی ہوں میں یہیں پڑا

جاؤں کہاں میں اے خدا، در کوئی دوسرا نہیں

جس زمانے میں سہرا لکھا گیا اور شادی کے بعد خواجہ صاحب کی خدمت میں سینی بھر کر امرتیاں بھیجی گئیں اور حضرت خواجہ صاحبؒ نے اپنے شکریے کے قطعے میں اُن کو "سونے کے کنگن" سے تشبیہ دی۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ خانقاہ میں ایک صاحب الہ آباد کے مقیم تھے۔ عمر رسیدہ زندہ دل، ظریف، خوش طبع، اور صاحبِ ذوق۔ شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے اور اساتذہ کا کلام اپنی باتوں میں بے تکلف نقل فرماتے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے فرمایا کہ میں نے مبارک بادی کا ایک شعر لکھا ہے اس لئے مجھے بھی کم از کم ایک امرتی ملنی چاہیئے۔ مبارک بادی کا شعر ایک پرچے پر مجھے لکھ کر دیا۔

بحمد اللہ رہی محفوظ ہر اک رسم و بدعت سے

یہ شادی سیدھی اور سادی مبارک ہو مبارک ہو

میں نے اِس بات کو سرسری سمجھا۔ مگر انہوں نے بار بار تقاضا فرمایا کہ بھئی میرے حصّے کی امرتی لاؤ۔ چنانچہ ایک روز کسی سلسلے میں گھر میں کافی مقدار میں پیڑے آئے جو تقسیم کئے جا رہے تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ایک پلیٹ میں پانچ پیڑے رکھ کر ان کو دے آیا۔ وہ لے کر خواجہ صاحبؒ کے پاس چلے گئے۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کی اور خواجہ صاحبؒ کی اس سلسلے میں کیا گفتگو چل رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحبؒ نے خواجہ صاحبؒ سے ازراہِ ظرافت وحسنِ مذاق یہ کہا ہوگا کہ امرتیاں ملنے میں کچھ آپ کی خصوصیت نہیں بلکہ مجھے بھی مل سکتی ہیں اور خواجہ صاحبؒ نے اس کی تردید کی ہو گی۔ بہرحال یہ معاملہ ان دونوں بزرگوں کی بے تکلف زندگی اور حسنِ مذاق سے متعلق ہے۔ خدانخواستہ کسی قسم کی بدمزگی یا دلوں کی کدورت کا اس سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں۔ کیونکہ ہم نے دیکھا ہے کہ ان شعری مناقشوں کے باوجود دونوں حضرات اسی طرح خلوص سے ملتے اور الفت و محبت کا برتاؤ رکھتے تھے۔ معاشرت ان واقعات سے ذرہ برابر بھی متاثر نہ تھی۔ اور ہوتی بھی کیسے ؟ دونوں بفضلہٖ تعالیٰ خدا رسیدہ بزرگ اور اللہ والے۔

غرض یہ کہ اگلے روز ان بزرگ نے مجھے بطور شکریے کے دو شعر لکھ کر دیئے ۔

تقسیم کیا اچھی رہی انعام کی سرکار من
مجنگن کو تو کنگن ملے، بھنگی کو چاندی کے بٹن

صد آفریں تقسیم پر، صد مرحبا تجویز پر
خوش آپ کو دائم رکھے پروردگارِ ذوالمنن

یہ صاحب خانقاہ کے مدرسے میں روزانہ ڈیڑھ گھنٹے حساب اور املا لڑکوں کو سکھاتے تھے جس روز انہوں نے یہ قطعہ لکھ کر مجھے دیا۔ میں لے کر گھر جا رہا تھا کہ راستے میں خواجہ صاحبؒ مل گئے۔ پوچھا کہ آپ کو شیخ صاحب نے بطور شکریہ کے کوئی قطعہ لکھ کر دیا ہے؟۔ میں نے جیب سے نکال کر پیش کر دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ میں آپ کو پھر دوں گا۔ چنانچہ اگلے روز واپس فرمایا۔ جس پر بہت سے اشعار لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے جو یاد رہ گئے پیش ہیں ؎

ملے پانچ پیڑے جو یہ تم کو بھائی! یہ ہیں پانچ جوتے نہ سمجھو مٹھائی
خبر بھی ہے تم نے سزا کیوں یہ پائی بھڑے تم جو مجذوب سے منہ کی کھائی
مری طرح سونے کے کنگن نہ پائے
مرے منہ کو آئے تو جوتے ہی کھائے

نہیں یہ بٹن ہڈیاں ہیں چبا لو کرو شکر آقا کا، دُم کو ھلا لو
بنو شیخ جی اپنے منہ سے نہ بھنگی اچھل جائے گی اپنی پگڑی سنبھالو
تمہیں ڈیڑھ گھنٹے کا ملتا ہی کیا ہے کہ اتنے میں تو تم کئی گھر کما لو
کہاں آ کے بیٹھے ہو تم مدرسے میں قلم چھوڑ دو اپنا پیجز سنبھالو
کوئی بزم شادی میں کہہ دے نہ تم کو یہ بھنگی ہے بھنگی، نکالو نکالو
نہیں پانچ پیڑوں کا مطلب کہ کھا لو
اشارہ ہے پاپانچ پاپانچ اپنے سر میں لگا لو

دونوں بزرگوں کی یہ نوک جھونک جو سراسر دوستانہ تھی، ایک عرصے تک چلتی رہی۔ ہوتا یہ تھا

کہ شیخ صاحب ایک آدھ شعر کہہ دیتے اور خواجہ صاحب ایک دریائے رواں کی طرح امنڈ پڑتے اور شیخ صاحبؒ خاموشی، خندہ پیشانی اور مسکراہٹوں کے ساتھ اس محبانہ ہجو کو سنتے رہتے اور پھر دو چار روز کے بعد دو تین شعر موزون کر دیتے۔ یہ تمام اشعار کسی جگہ بھی ضبط نہیں۔

خواجہ صاحبؒ کے وصال کے بعد، ان کے متوسلین، احباب اور شائقین کی طرف سے یہ تقاضا شروع ہوا کہ ان کا کلام شائع کیا جائے اور اس کے لئے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ ان کے صاحبزادگان سے عرض کیا جائے کہ وہ یہ کام خود کریں، یا کسی ایسے شخص کے سپرد کر دیں جو اسے کرنے کی لگن اور استعداد رکھتا ہو۔ کچھ عرصے کے بعد کسی ماہانہ رسالہ میں غالباً "معارف" میں یہ خوشخبری پڑھی کہ خواجہ صاحبؒ کا کلام مرتب کیا جا رہا ہے۔ جو عنقریب شائع ہو کر ہدیۂ ناظرین و شائقین ہوگا۔ اس کا دیباچہ یا پیش لفظ حضرت العلام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے لکھنے کی درخواست کی گئی تھی، علامہ موصوف نے خواجہ صاحب کی رحلت پر "فراقِ مجذوب" کے نام سے بھی تحریر فرمایا جو پہلے "معارف" میں چھپا اور اب "یادِ رفتگاں" میں موجود ہے۔ اسی طرح شاہ معین الدین احمد ندوی نے ایک تفصیلی مضمون "وادیِ ایمن" کے نام سے معارف میں شائع فرمایا۔ لیکن تا دمِ تحریر یہ کام نہیں ہو سکا۔ خواجہ صاحبؒ کا کچھ کلام تو ان کی حیات میں طبع ہوا جس میں رسالہ "نمکدانِ ظرافت" "تفسیر غیب" "مراقبہ موت" "دوازدہ اذکارِ عبرت" "جذباتِ مجذوب" حصہ اول و دوم "فریادِ مجذوب" "فغانِ بیوہ" وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید ظہور الحسن صاحب نے ایک مجموعہ اس طرح مرتب فرمایا کہ جہاں جہاں سے ان کا کلام ملا اس کو جمع کر کے چھاپ دیا اور نام اس کا "کشکولِ مجذوب" رکھا۔ اس میں طبع شدہ کلام شائع نہیں کیا گیا۔

حضرت خواجہ صاحب کے صاحبزادگان نے ان کی وفات کے بعد ان کا کلام کسی کو نہیں دیا بلکہ ان حضرات کا ارادہ خود ان کو شائع کرنے کا ہے خدا کرے کہ یہ کام جلد پایۂ تکمیل کو پہنچے۔

اِبتدائی زِندگی

(خود نوشت سوانح حیات)

ابتدائی زندگی

اس خاکسار و ذرہ بے مقدار کو عزیز الحسن کہتے ہیں۔ میرے اہل خاندان اپنے آپ کو خواجہ غوری اس لئے کہتے ہیں کہ ہمارے اجداد میں سے بہ عہد شاہ ہمایوں ایک صاحب الہ داد ابن غوری خواجہ تھے جن کا کتبہ ہمارے قصبہ کی مسجد میں بہ حیثیت بانی مسجد کے لگا ہوا ہے اور ان ہی کے نام سے ہماری جائیداد تھوک الہ داد کہلاتی ہے اور یہی نام اس جائیداد کا کاغذات دیہی میں درج ہے۔ نیز جس محلہ میں ہم لوگ رہتے ہیں وہ محلہ بھی غوری پاڑہ کے نام سے مشہور چلا آتا ہے اور ہم لوگوں کا قصبہ آصف آباد جو بھرت پور میں واقع ہے حسب اخبار و آثار سلطان شہاب الدین غوری فاتح ہندوستان کے زمانے سے آباد ہے۔

چنانچہ میں نے ایک ثقہ اہل وطن سے روایت سنی تھی کہ جب سلطان شہاب الدین غوری نے راجپوتانہ کا یہ حصہ فتح کیا تو ان کے ہمراہی لشکری اور امراء اسی انواع میں بارہ مختلف مقامات پر آباد ہو گئے اور وہ بارہ بستیاں مسلمانوں کی اب تک موجود ہیں جن میں سے ایک ہمارا قصبہ بھی ہے جس میں مختلف قبیلوں کے مختلف محلے ہیں، مثلاً غوری پاڑہ، قاضی پاڑہ، سید پاڑہ وغیرہ کیونکہ لشکر میں مختلف قبیلوں کے لوگ تھے اور ان ہی بارہ بستیوں میں سے قصبہ بیانہ بھی ہے جو ایک مشہور تاریخی مقام ہے اور جہاں کثرت سے معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں اور جو ایک بہت بڑا گنج شہیداں سمجھا جاتا ہے۔

پرانے کاغذات میں ہمارے قصبے کا نام آصف آباد درج ہے اور ایک قبر بھی بانی قصبہ

آصف الدولہ کی کہی جاتی ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس انواع میں ایک شیعی حکمران نے حملہ کیا تھا تو ہماری بستی اس سے نہ دبی اس لئے اس کا عرف نہ دبی ہوگیا اور بعد کو کثرت استعمال سے مذہبی ہوگیا اور اس کے مقابل ایک دوسری بستی قریب ہی واقع ہے۔ اس کو شیعی حکمران نے پہر بھر ہی میں سر کر لیا اس لئے اس کا نام پہر سر ہو گیا۔

ہمارے قصبہ کا پرانا ہونا اس سے بھی ظاہر ہے کہ مقبروں، مسجدوں اور کنوؤں میں بابر، ہمایوں اکبر، اور رنگ زیب وغیرہ پرانے بادشاہوں کے زمانے کے بہت سے کتبے اب تک موجود ہیں۔ جن کو بھائی صاحب مرحوم نے جمع کر کے طبع بھی کرایا تھا۔ نیز اہل برادری کے پاس جن میں قاضی، چودھری اور پٹیل بھی شامل ہیں بہت پرانے پرانے فرامین شاہی بھی موجود ہیں۔ ایک قبر کے کتبہ میں مجھے بہت دن کے دیکھے ہوئے یہ الفاظ بھی یاد ہیں (شہید شهد در کالجز) ان الفاظ سے پہلے نام بھی درج تھا جو اس وقت یاد نہیں آتا غالباً ابراہیم تھا۔ اس نام کے آگے غوری اور ہفت ہزاری بھی لکھا ہوا تھا۔

میرا آنا جانا اور رہنا وطن میں بہت کم ہوا ہے کیونکہ والد ماجد مولوی خواجہ عزیز اللہ صاحب مرحوم جن کی وفات کا مادہ تاریخ مغفور ہے بہ سلسلہ وکالت اوڑی ضلع جالون میں رہنے لگے تھے اور میری پیدائش بھی وہیں کی ہے اور وہ مقام اب تک ہم لوگوں کا وطن ثانی بنا ہوا ہے گو رشتہ داریاں اہل وطن ہی میں ہوتی ہیں۔ جناب والد صاحب مرحوم و مغفور اوڑی کے دو مقتدر ترین وکلاء میں سے تھے جن میں سے ایک ہندو تھے۔ اکثر یہ کہا جاتا تھا کہ اگر کسی موکل نے ایک کو اپنا وکیل کیا تو اس کے مقابلہ میں دوسرا فریق دوسرے کو ضرور کرتا تھا۔ والد صاحب کبھی کمزور اور جھوٹے مقدمے نہ لیتے تھے اور بہت محنت کے ساتھ مقدمہ کی تیاری کرتے تھے۔ احقر نے خود دیکھا ہے کہ لیٹے ہوئے مسل پڑھتے جاتے ہیں۔ اور بار بار سینہ پر رکھ کر بلا مسل دیکھے واقعات کا اور جن امور کو بحث میں پیش کرنا ہے ان کا ذہنی اعادہ کرتے جاتے ہیں۔ تدین اور محنت تھا تو کی عام شہرت تھی جس نے وکالت کو نہایت چمکا دیا تھا۔ کنبہ پرور ایسے تھے کہ پچاس پچاس آدمیوں کا کھانا دونوں وقت پکتا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ کی ایک بہت بڑی اور وزنی لگن اور بڑے بڑے پتیلے اب تک موجود ہیں۔ باوصف اس کنبہ پروری کے اس کا بھی

بہت خیال رکھتے تھے کہ کہیں مفت خوری اور بیکاری کی عادت نہ پڑ جائے۔ اگر کوئی صاحب قرض مانگتے اور جن سے بوجہ تنگدستی ادائگی کی توقع نہ ہوتی تو بجائے قرض کے جتنا ہو سکتا تھا ویسے ہی دے دیتے تھے اور فرما دیتے کہ اس کی ادائگی کی فکر نہ کیجئے گا۔ ہم لوگوں سے اس کی مصلحت یہ بیان کرتے کہ قرض سے جانبین میں بے لطفی پیدا ہونے کا ایسے موقع پر قوی اندیشہ ہے۔

بہ سلسلۂ وکالت ہر ملت و مذہب کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ بالخصوص اہل کاروں سے جن میں سے بعض سے خصوصی تعلقات تھے لیکن مذہبی امور میں کبھی اپنے مسلک کے خلاف ان کی خاطر سے کسی امر کا ارتکاب نہیں کیا اور نہ ان کی مذہبی مجالس میں کبھی شرکت کی۔ چنانچہ بعض اہل شیعی اہل کاروں سے بہت زیادہ تعلقات تھے لیکن ان کی مجالس عزا میں کبھی شرکت نہیں فرمائی۔ صاف فرما دیا کرتے تھے کہ ذاتی تعلقات اپنی جگہ ہیں مذہبی امور اپنی جگہ۔ بعض عام جلسوں میں محفل رقص و سرود بھی اس زمانہ میں منعقد ہوتی تھی جس میں علاوہ عمایدِ شہر کے کلکٹر اور دیگر حکام بھی شریک ہوتے تھے۔ ایسے مواقع پر قبل شروع ہونے کے حکام کا استقبال کرنے کے لئے پہنچ جاتے اور پھر اس مقام سے اتنے فاصلے پر کرسی بچھوا کر بیٹھے رہتے جہاں گانے بجانے کی آواز کانوں میں بھی نہ پڑے اور جب محفل ختم ہو جاتی تو پھر حکام کو رخصت کرنے کے لئے پہنچ جاتے اور ساتھ ہو لیتے۔ ایسی پختہ وضع اور ایسے پختہ اصول کے تھے کہ جو وضع اور طرز معاشرت اختیار کر لیا عمر بھر اس کو نباہا۔

چنانچہ جامع مسجد میں ہمیشہ ایک جگہ نماز پڑھتے۔ یہاں تک کہ لوگ اس جگہ کو والد صاحب کے لئے خالی رکھتے اور ہمیشہ جامع مسجد میں ہی نماز تراویح پڑھتے اور شب قدر میں جاگنے والوں کے لئے ہمیشہ پلاؤ زردہ وہاں بڑے اہتمام سے بھیجتے۔ اس طرح پرانی وضع کا جو لباس شروع میں اختیار فرمایا بس اسی کو عمر بھر رکھا، کبھی نہ بدلا اور جس سے ایک بار خصوصی تعلقات پیدا کر لئے، ہمیشہ ان کو قائم رکھا۔ چنانچہ جب بھائی صاحب مرحوم کا ان کے ایک پرانے دوست سے سخت اختلاف ہو گیا۔ تو فرمایا اول تو ہم ہر کسی سے دوستی ہی نہیں کرتے لیکن اگر اس سے دوستی کر لیتے تھے تو پھر ہمیشہ اس کو نباہتے تھے تم لوگوں کی طرح نہیں کہ آج دوستی ہے کل دشمنی۔

ہم لوگوں کے اخلاق کا اتنا خیال تھا کہ سکول تنہا جانے نہ دیتے تھے بلکہ نوکر کو ساتھ بھیجتے اور واپسی کے وقت بھی نوکر کو بھیج دیتے کہ وہ اپنے ہمراہ سکول سے لائے۔ نیز اس کی سخت تاکید تھی کہ بازار کے راستہ سے سکول نہ جائیں دوسرے راستہ سے جائیں چنانچہ اسی عادت قدیمہ کی بنا پر احقر کو اب تک اس بازار کے راستہ سے گذرتے ہوئے تامل ہوتا ہے۔ خرافات کی طرف بالکل میلان نہ تھا جو کام کرتے نہایت اطمینان اور سوچ سمجھ کر کرتے اور مشورہ کرتے حالانکہ سب ان سے چھوٹے ہی تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ مشورہ کرنا مسنون ہے۔ غیر اعزہ کے گھر خواہ کتنے ہی خصوصی تعلقات کیوں نہ ہوں باوجود شدید اصرار کے بھی کبھی اپنے یہاں کی مستورات کو نہ جانے دیتے تھے بلکہ اس امر میں بربنائے مصالح اتنی احتیاط تھی کہ بہشتن بھنگن وغیرہ عورتوں سے بھی باقاعدہ پردہ کراتے تھے کسی کو بلا پکارے اور پردہ کرائے اندر جانے کی اجازت نہ تھی۔ ڈپٹی مولوی کریم بخش صاحب نے بہت اصرار کیا تو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ہمارے یہاں کی مستورات کے پاس زیور کم ہے وہ آپ کی مستورات سے شرمائیں گی اس پر ڈپٹی صاحب نے ایک بڑے مقدمے میں والد صاحب کے موافق فیصلہ دیا جس میں موکل سے کثیر رقم ملی پھر فرمایا کہ لیجئے اب تو زیور بنوا لیجئے اور مستورات کو ہمارے یہاں کی مستورات سے ملوا دیجئے لیکن پھر بھی نہ ملوایا۔

اسی طرح غیر برادری میں کسی جگہ رشتہ داری نہیں کی۔ بعض بڑے بڑے لوگوں نے خواہش کی تو فرما دیا کہ ہم باہر کی چاہے جتنی شریف عورت لے آئیں لیکن ہمارے یہاں کی مستورات اسے اپنے سے کم درجہ کی سمجھیں گی۔ اس لئے اس سے خواہ مخواہ توہین ہو گی۔ نسل کی حفاظت کا اتنا خیال تھا کہ برادری کے بعض خاندانوں کے متعلق کہہ رکھا تھا کہ ان سے رشتہ داری نہ کی جائے۔ استقلال کی یہ شان تھی کہ بڑے سے بڑے حادثہ اور بڑی سے بڑی خوشی کے موقع پر از جار فتہ نہ ہوتے۔ دونوں مواقع پر صرف لفظِ خیر زبان پر ہوتا تھا۔ البتہ لہجہ ہر موقعہ پر مختلف ہوتا حالانکہ قلب ایسا حساس تھا کہ دونوں مواقع پر بہت متاثر ہوتے تھے جن کا علم دیگر آثار سے ہوتا۔ مثلاً رنج اور خوشی دونوں مواقع پر آب دیدہ ہو جاتا یہاں تک کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری بڑی ہمشیرہ صاحبہ کے انتقال کی خبر چچا صاحب مرحوم

کو مجھ سے لکھوا رہے تھے تو ہر ہر جملہ پر طویل طویل سکوت فرماتے تھے کیونکہ دل بھر بھر آتا تھا اور صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بہت کوشش کر رہے ہیں کہ ضبط فرمائیں۔ پڑوسیوں کے حقوق کا اتنا خیال فرماتے تھے کہ چونکہ ہمارا مکان ہندوؤں کے محلہ میں ہے جس میں صرف ہمارا گھر ہی مسلمانوں کا ہے۔ نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ گوشت کھلا ہوا نہ لائیں اور گھر میں بھی سخت تاکید تھی کہ ہڈیاں راکھ میں دبا دی جائیں تاکہ کوئی اٹھا کر نہ لے جائے اور کسی پڑوسی کے گھر میں نہ ڈال دے جس سے اس کو تکلیف ہو۔ اس برتاؤ کا یہ اثر تھا کہ محلے والے باوجود ہندو ہونے کے اس قدر ادب و احترام کرتے تھے کہ جب والد صاحب کو آتے دیکھتے تو حقہ الگ کر دیتے تھے اور کھڑے ہو جاتے تھے۔ حیادار اتنے تھے کہ کرتے کے نیچے کا بدن بھی کسی کے سامنے نہ کھولتے تھے۔ مرض وفات میں بھی جبکہ بمشکل چوکی تک قضاء حاجت کو جا سکتے تھے والدہ صاحبہ مرحومہ کو نہ رہنے دیتے تھے۔ عاقل اور مصلحت اندیش اتنے تھے کہ جب ہم لوگوں کو تنبیہاً مارتے تو اندر والدہ صاحبہ کے پاس لے جا کر مارتے تاکہ غصہ کی حالت میں زیادتی نہ ہونے پائے اور وہ بچا لیں، ایک بار چھوٹے بھائی کو نماز نہ پڑھنے پر مارا تھا اور فرمایا تھا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر دس برس کی عمر کے بعد بھی اولاد نماز نہ پڑھے تو اس کو مار کر پڑھوانا چاہیئے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہم لوگوں کو محنت کرنے کی نہایت تاکید کرتے رہتے لیکن تعلیم کو صحت پر ہرگز مقدم نہ کرتے۔ خود احقر سے فرمایا کہ ایسا پڑھانا نہیں چاہتا کہ صحت خراب ہو جائے۔ اور ایک منصف صاحب کا حال بیان کیا جو ہمیشہ کمزور اور بیمار رہتے اور فرمایا کہ صحت خراب کر کے اگر کوئی عہدہ بھی حاصل کیا تو کس مصرف کا۔

اولوالعزم اتنے تھے کہ جب احقر انسپکٹر آبکاری میں علی گڑھ سے نامزد ہو کر لے لیا گیا اور کام سیکھنے شاہجہاں پور چلا گیا تو مجھکو لکھا کہ میں نے بی اے انسپکٹری کے لئے نہیں کرایا تھا فوراً چھوڑ کر چلے آؤ چنانچہ میں چلا آیا پھر ڈپٹی کلکٹری کے لئے کوشش فرمائی تو جس میں حضرت والا کی دعا کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ کامیابی ہو گئی۔ باوجود کہ وہ استقلال ہونے کے رقیق القلب ایسے تھے کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عربی کی اس مناجات منظوم جو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی جانب منسوب کی جاتی ہے نہایت کیف

کے ساتھ پڑھتے جاتے اور روتے جاتے لیکن ساتھ ہی ضبط کی کوشش بھی کرتے جاتے۔

دادا پیر حضرت حاجی صاحب مہاجر مکی سے بذریعہ خط بیعت تھے اور حضرت والا سے حسب امر حضرت حاجی صاحب تعلیم حاصل کی تھی۔ قوی القلب اور شجاع ایسے تھے کہ جب میرے چچازاد بھائی یونس ٹریننگ اسکول میں سب انسپکٹری کا کام سیکھنے کے لئے بھیجے گئے تھے تو انہوں نے لکھا کہ یہاں گھوڑے کی سواری میں بڑی سختی کی جاتی ہے یہاں تک کہ ایک شخص دوران تعلیم گھوڑے سے گر کر مر گیا جس سے سخت وحشت ہے۔ اس کا نہایت ہمت افزا جواب لکھوایا کہ تمہاری اس بزدلی سے بہت افسوس ہوا۔ ہم لوگ تو غوری ہیں۔ ہمارے اجداد نے تو ہندوستان کو فتح کیا ہے اور سپہ گری تو ہمارا آبائی پیشہ ہے افسوس ہے کہ تم گھوڑے کی سواری سے ڈرتے ہو۔ بڑی کم ہمتی کی بات ہے۔

مدرسی کے زمانہ میں للت پور سے وطن جا رہے تھے گھوڑے پر سوار تھے۔ تلوار ہاتھ میں تھی راستہ میں ایک شیر نظر پڑا۔ یہ سمجھ کر کہ اب جان بچانا مشکل ہے۔ گھوڑا روک لیا۔ خود فرماتے تھے کہ مرتا کیا نہ کرتا ہم نے بھی تلوار میان سے نکالی اور سوچ لیا کہ آج جان تو جاتی ہی ہے۔ ہم بھی وار کئے بغیر نہ رہیں گے لیکن حسنِ اتفاق سے شیر کا رخ کسی طرف پھر گیا اور وہ بے پروائی کے ساتھ نکلا ہوا چلا گیا۔ ہم لوگوں سے بچپن کے زمانہ میں بیان فرمایا کرتے تھے ـــــــ کہ ایک بار ایک شیر قصبہ کے قریب آگیا غالباً للت پور ہی کا واقعہ ہے اس کے مارنے کی فکر ہوئی ہم بھی بندوق لے کر پہنچ گئے۔ اس سلسلہ میں شیر کے گرجنے کی نقل ہم لوگوں کی دل چسپی کے لئے اتارا کرتے تھے اور ایسے ہیبت ناک انداز سے نقل اتارتے تھے کہ باوجود ہم لوگ دل چسپی لینے کے مارے ڈر کے ہر بار سہم بھی جاتے تھے۔ علاوہ دلچسپی پیدا کرنے کے اس قسم کے واقعات ہم لوگوں کے اندر دلیری پیدا کرنے کی غرض سے بیان کرتے بہت وجیہ بارعب اور قوی تھے۔ ایک بڑا کٹورہ تھا جس میں سیر بھر دودھ آتا تھا۔ روزمرہ اس کو بھر کر دودھ پینے کا معمول تھا جس وقت غسلِ میت کے لئے تختہ پر لٹائے گئے تو ایک عزیز نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑا فوجی جرنیل لیٹا ہوا ہے۔

والد صاحب نے جو کچھ بھی پڑھا تھا اس پر عمل کرتے تھے چنانچہ موقع بہ موقع بزرگوں کے اقوال نقل فرماتے تھے۔ ایک بار کسی موقع پر فرمایا کہ حضرت سعدیؒ نے فرمایا ہے ۔ دیوار ہم گوش دارد۔

مرض وفات میں چونکہ سانس اکھڑ رہا تھا۔ سب اعزہ کو بلاکر حسب عادت علاج کے متعلق مشورہ فرمایا اور فرمایا کہ گو مجھے اب دنیا میں کیا کرنا رہ گیا تھا بفضلہٖ تعالیٰ سب کچھ کر لیا ہے لیکن چونکہ مسنون ہے اور مجھے تکلیف بھی ہے اس لئے آپس میں مشورہ کر کے کوئی باقاعدہ علاج کی صورت تجویز کر لی جائے۔ اسی دوران مرض میں ایک بار بے ہوشی ہو گئی تو چونکہ خود بھی طب پڑھے ہوئے تھے اس لئے ہوش میں آنے کے بعد فرمایا کہ پھر بے ہوشی ہو جائے تو فلاں تدابیر عمل میں لائی جائیں۔

۳، یا ۴ ، ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ بروز شنبہ غالباً ۶۲ یا ۶۸ سال کی عمر میں بہ وقت اشراق رحلت فرمائی۔

حکام اور غیر حکام سب والد ماجد کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ وکیل سرکار اور وائس چیئرمین بورڈ بنائے گئے جبکہ کلکٹر چیئرمین ہوا کرتے تھے اور آج تک ان ہی کی بدولت ہم لوگوں کا بفضلہٖ تعالیٰ اقتدار قائم ہے اور ہم لوگوں نے جتنی دنیاوی ترقی کی ہے والد ماجد ہی کی بدولت کی ہے چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ ہم میں سے متعدد اشخاص بڑے بڑے عہدوں پر براہِ راست فائز ہوئے اور اب تک ہیں۔ میرے ایک بھانجے کلکٹری کے عہدہ تک پہنچ کر پنشن یاب ہوئے اور اب ایک ریاست کے دیوان ہیں اور بڑی تنخواہ پاتے ہیں اور بڑے اختیارات حاصل ہیں اور دو خطابات حاصل کئے ہیں۔ میرے بھائی صاحب خواجہ عزیز الرحمٰن مرحوم بھی ایک ریاست کے وزیر تھے اور بہت ہی ہر دل عزیز۔ ذی وجاہت۔ خطاب یافتہ اور صاحب اقتدار تھے۔

غرض والد صاحب بڑی شخصیت رکھتے تھے اور بہت ہی ذی وجاہت متین باحیا بااصول، متدین۔ متشرع اولوالعزم اور علوم سے بہت ہی دلچسپی رکھنے والے بزرگ تھے۔ لڑکپن سے آخر تک جہاں رہے ہمیشہ ممتاز رہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں استاد نے اپنا خلیفہ بنا دیا تھا اور آخر عمر تک اہل وطن ان کو خلیفہ جی کہتے رہے۔ طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ خود بیان فرماتے تھے کہ ہم سبق طلباء کے ساتھ دسہرہ کا جلوس دیکھنے بھرت پور گئے تو پڑھنے کا اتنا شوق تھا کہ کتاب ساتھ لے گئے

اور مطالعہ میں ایسے محو ہوئے کہ جلوس نکل گیا اور انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ اسی طرح وکالت کے امتحان کی تیاری کے دوران ران میں پھوڑا ہو گیا تھا تو اس میں اس قدر سوزش تھی کہ رات بھر ملازم پانی ڈالتا رہتا تھا اور خود مطالعہ میں مشغول رہتے تھے۔ معمر بزرگوں نے بیان کیا کہ ہم نے ان کو بچپن میں ہمیشہ متین ہی دیکھا یہاں تک کہ اور لڑکے کبڈی کھیلتے اور وہ ان کے کپڑوں اور جوتوں کی حفاظت کرتے رہتے اور کھیل کود دیکھتے رہتے اور خود شریک نہ ہوتے۔

اللہ تعالیٰ نے رعب ایسا عطا فرمایا تھا کہ باوجود شفیق ہونے کے اور اکثر بالکل خاموش یا لیٹے ہوئے تسبیح پڑھنے کے سب چھوٹے بڑوں ہر ایک پر ہیبت طاری رہتی تھی چنانچہ میرے استاد جناب مولانا مولوی ہدایت اللہ کیرانوی ؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر وکیل صاحب سامنے سے آتے ہوں تو میں ایک میل کے چکر کو گوارا کر لوں لیکن یہ ہمت نہ ہو کہ ان کے پاس سے ہو کر گزروں اور یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ میں گھر پر آتے ہی پہچان لیتا ہوں کہ آج وکیل صاحب موجود ہیں یا نہیں کیونکہ ان کی موجودگی میں گھر کا رنگ ہی اور ہوتا ہے بعض اوقات بڑے بڑے عہدہ دار ڈپٹی کلکٹر وغیرہ آپس میں ہنسی مذاق کرتے ہوتے اور ان کو خبر ہو جاتی کہ والد صاحب قریب سے گذر رہے ہیں تو سب غایت احترام سے خاموش ہو جاتے اور کہتے کہ چپ رہو مولوی صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

محلہ والے بھی باوجود ہندو ہونے کے اتنا ادب کرتے کہ اگر حقہ پیتے ہوتے تو دیکھ کر حقہ الگ کر دیتے اور کھڑے ہو جاتے۔ جب جنازہ نکلا تو کہنے لگے کہ آج ہمارے محلہ کی رونق رخصت ہو رہی ہے

احقر ناظرین سے معافی چاہتا ہے کہ بجائے اپنا تعارف کرانے کے والد صاحب کا تعارف کرانے لگا لیکن اگر یہ نہ کہوں کہ پدرم سلطان بود تو اور کیا کہوں کیونکہ خود مجھ میں تو کوئی صفت ہے ہی نہیں جس پر اپنے تعارف کو مبنی کیا جا سکے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا احقر ابتداً ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر مامور ہوا تھا۔ پھر سات برس اس عہدہ پر رہ کر نصف تنخواہ پر محکمہ تعلیم میں اپنی خدمات منتقل کروالیں کیونکہ وہاں فیصلے کرنے پڑتے تھے۔ الحمدللہ اس محکمہ میں بھی بہ برکت دعا حضرت والا تا عہدہ انسپکٹری ترقی پا چکا ہوں جو محکمہ تعلیم میں ایک عہدہ جلیلہ سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ مشاہرہ بفضلہ تعالیٰ چھ سو ساٹھ روپے پر پہنچ چکا ہے اور

تیس روپے سالانہ ترقی ہے ۔ غرض اللہ تعالیٰ اپنے گدھوں کو بھی خشکہ دے رہا ہے یہ سب حضرت والا کی برکات ہیں ۔ چونکہ الحمد للہ حضرت والا کے فیض صحبت اور برکت تعلق کی بدولت ہمیشہ نہایت تدین اور محنت شاقہ کے ساتھ اپنا کام منصبی انجام دیا ہے اس لئے ازراہ قدردانی گورنمنٹ نے حکام کی پرزور سفارش پر خان صاحب کا خطاب بعد ہیں خان بہادری کا خطاب بلا درخواست دے دیا ہے اور تاجپوشی کے موقع پر تمغہ بھی ملا ہے گو یہ احقر ہرگز اس قابل نہیں ہے لیکن محض حضرت والا کے تعلق کی برکت سے بفضلہ تعالیٰ دینی اور دنیوی لحاظ سے لوگ عموماً بہت عزت اور وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جس سے مجھ کو نہایت خجلت ہوتی ہے بمصداق شعر ؎

طاؤس را بہ نقش و نگارے کہ ہست خلق

تحسین کنند و او خجل از پائے زشت خویش

غرض بفضلہ تعالیٰ حضرت والا کی اس بشارت کا ظہور ہو رہا ہے جو عرصہ دراز ہوا احقر کے ایک عریضہ کے جواب میں بایں الفاظ تحریر فرمائی تھی کہ انشاء اللہ صلاح و فلاح دارین حاصل ہوگی ۔ دل یہی گواہی دیتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی اس بشارت کو من کل الوجوہ صادق فرمادے ۔ یہاں کی بھی ہر قسم کی صلاح نصیب فرمائے اور ایمان کامل پر خاتمہ فرما کر وہاں کی بھی فلاح تام نصیب فرمائے آمین ثم آمین ۔ اس جگہ مجھے اپنی ایک دعائیہ رباعی یاد آتی ہے جو اس وقت میں نے کہی تھی جب موٹر کار خریدی تھی وہ یہ ہے ۔

عیش ہے عزت ہے موٹر کار ہے

اور اس دنیا میں کیا درکار ہے

اس جہاں کی نعمتیں بھی ہوں عطا

اے خدا تیری بڑی سرکار ہے

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ باوجود نہایت نااہل اور ناکارہ محض ہونے کے اللہ تعالیٰ نے اس احقر کو نہایت کامیاب زندگی عطا فرمائی ہے جس سے واللہ مجھ کو سخت حیرت و استعجاب ہے ۔ اللہ تعالیٰ شکر کی توفیق عطا فرمائے ۔ علی گڑھ کالج میں طالب علمی کے زمانہ میں باوجود داڑھی رکھنے اور کوٹ پتلون نہ

پہننے کے جس انگریز یا ہندوستانی استاد یا افسر سے سند طلب کی اس نے یہی لکھا کہ علی گڑھ کالج کے طالبعلم کا بہترین نمونہ ہے۔ ایک صاحب نے یہ لکھا کہ یہ جس عہدہ پر پہنچے گا اس عہدہ کے معیار کو بلند کر دے گا۔

مَیں نے بی۔ اے تیسرے درجے میں پاس کیا کیونکہ پڑھنے میں کبھی جی نہ لگایا۔ استاد سبق کی تقریر کرتے رہے اور مَیں یوں ہی خالی الذہن بیٹھا رہتا۔ ایک لفظ بھی نہ سنتا تھا بلکہ طالب علموں سے پرچوں کے ذریعے مکاتبت کرتا رہتا اور زمانہ امتحان کے قریب دن رات محنت شاقہ کر کے بفضلہٖ تعالیٰ پاس ہو جاتا۔ والد ماجد نے بی۔ اے کے آخر زمانہ میں یہ معلوم کر کے کہ اس نے کچھ نہیں پڑھا ہے یہ انتظام کیا کہ خود پاس بیٹھے رہتے لیکن اس حالت میں مناجاتیہ اشعار لکھتا رہتا اور والد صاحب سمجھتے رہتے کہ یہ کتاب دیکھنے میں مشغول ہے لیکن الحمد للہ کہ مناجات ہی سے میرا کام نکل گیا اور غیب سے ایسی مدد ہوئی کہ باوجود بالکل مایوسی کے مَیں بفضلہٖ تعالیٰ کامیاب ہو گیا۔

ایک مضمون میں دو پرچے تھے۔ ایک پرچہ کی کتابیں مَیں نے بالکل دیکھی ہی نہیں تھیں اور کوئی صورت کامیابی کی نہ تھی یہاں تک کہ دعا کرتے وقت یہ وسوسہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نعوذ باللہ ایسی حالت میں میری کیونکر مدد کر سکے گا جبکہ مَیں نے اس پرچہ کی کوئی کتاب ہی نہیں دیکھی۔ اور میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اس پرچہ کے امتحان میں شریک نہ ہوں گا۔ اللہ بھلا کرے میرے ایک مخلص دیندار دوست کا جنہوں نے مجھ کو شریک امتحان ہونے پر مجبور کیا۔ چنانچہ مَیں مایوسی کے عالم میں شریک ہوا۔ قدرت خداوندی دیکھئے کہ غالباً ممتحن کی غلطی سے یا جو بھی صورت ہوئی اس پرچہ میں ایک ایسی کتاب کے سوالات دے دیئے گئے جو پہلے پرچہ میں آ چکی تھی اور جو مجھ کو یاد تھی ایسا کبھی اس سے قبل کے امتحانوں میں نہ ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میری آنکھیں کھل گئیں اور غایت شکر میں آنکھوں سے آنسو آ گئے اور بے اختیار کہنے لگا کہ آپ کو یا اللہ واقعی ہر قسم کی قدرت حاصل ہے اور مایوسی کے عالم میں بھی کامیاب فرما سکتے ہیں۔ چنانچہ بفضلہٖ تعالیٰ پاس ہو گیا لیکن تیسرے درجے ہی میں۔

اسی زمانہ میں تحصیلداری کی درخواستیں جا رہی تھیں۔ مَیں نے بھی درخواست دے دی لیکن اس کے

لئے دوسرے درجہ میں پاس ہونے کی شرط تھی۔ اس لئے اس بنا پر میری درخواست مسترد ہو گئی۔ اعزا نے برا بھلا کہنا شروع کیا کہ ذرا محنت کرتے تو تحصیلداری رکھی ہوئی تھی۔ مَیں نے کہا یہاں تو پاس ہونے کے ہی لالے پڑے ہوئے تھے۔ دوسرے درجہ میں کیا پاس ہو سکتا تھا اور یہ بھی کہا کہ اس میں بھی کوئی حق تعالیٰ کی مصلحت ہو گی۔ چنانچہ اس موقع پر ایک رباعی بھی اس مضمون کی لکھی گئی تھی کہ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ والد صاحب لاٹوش صاحب گورنر کے پاس گئے اور مستثنیٰ کر دینے کی درخواست کی لیکن گورنر صاحب نے فرمایا کہ قواعد عمل کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ مستثنیٰ کرنے کے لئے مستثنیٰ تو نہیں کر سکتا البتہ ڈپٹی کلکٹری کے لئے دوسرے درجہ میں بی اے پاس ہونے کی قید نہیں ہے وہ مل سکتی ہے تحصیلداری نہیں مل سکتی۔ پھر والد صاحب نے ڈپٹی کلکٹری کے لئے کوشش کی اس میں بفضلہ تعالیٰ کامیابی ہو گئی۔ اور اللہ تعالیٰ کی مصلحت کا ظہور ہو گیا۔ جب ڈپٹی کلکٹری کے امتحان میں بوجہ عدم دلچسپی کامیابی نہ ہوتی تھی تو آخری موقع پر غیب سے احقر کی یہ مدد ہوئی کہ اس سال سے قانون کی کتابیں دیکھ دیکھ کر جوابات لکھنے کی اجازت مل گئی اور احقر پاس ہو گیا۔

غرض ہر موقع پر شروع ہی سے اللہ تعالیٰ نے اس ناکارہ کی دستگیری فرمائی ہے اور اب تک فرما رہا ہے۔ چنانچہ انسپکٹری بھی اسی طرح بلا توقع نصیب ہو گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں اسی طرح ناکارہ کی اعانت فرماتا رہے۔ مَیں چونکہ بالکل لاابالی اور بدانتظام شخص ہوں۔ اس لئے مَیں نے اکثر قریب قریب ہمیشہ دیکھا کہ میرے پاس رہتے ہوئے بفضلہ تعالیٰ بچے عموماً بہت ہی کم بیمار پڑتے ہیں جب شدید بیماریاں ہوئیں تو ایسے موقع پر کہ وہ اپنی ننہال یا دیگر اعزہ کے پاس تھے جہاں اچھی طرح تیمارداری اور علاج ہو سکا۔ مَیں نے بس یہ سن لیا کہ بہت بیمار ہو گئے تھے لیکن بفضلہ تعالیٰ اچھے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ضعیف بندوں کو کسی رعایت میں بقول انشاء ؏

تصدق اپنے خدا کے جاؤں یہ پیار آتا ہے مجھ کو انشاء

ادھر سے ایسے گناہ پیہم ادھر سے یہ دمبدم عنایت

اور بقول نظیری ؏

بہ ازیں نمی تواں شد کہ نصیب شد نہ اول
گنہ و جنابت از من کرم و عنایت از تو

میں تو اپنی پوری زندگی کو اول سے اسی کا مصداق پاتا ہوں اور اس کو سراپا ایک اعجاز قدرت سمجھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آخرت بھی درست فرمادیں جو اصل چیز ہے آمین۔

احقر کی تاریخ پیدائش ۱۹ شعبان المعظم ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۲ جون ۱۸۸۴ء ہے۔ غالباً بدھ کا دن تھا اور صبح صادق کا وقت تھا۔ تاریخی نام مرغوب احمد ہے کوئی مسلسل نسب نامہ تو محفوظ نہیں لیکن مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب مرحوم و مغفور کو اس کی تحقیق کا بے حد شوق تھا اور بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف ذرائع سے تحقیق کرکے بہت دور تک کا نسب نامہ مرتب فرما لیا تھا اور اپنی اولاد کی تاریخ پیدائش و وفات و واقعات مہمہ کی ایک باقاعدہ یادداشت رکھتے تھے جو ممکن ہے اب تک کہیں موجود ہو۔ گو بعض اہل برادری نے معمر بزرگوں سے سلسلہ نسب کو حضرت علی کرم اللہ سے ملا دیا ہے لیکن ہم لوگ در اصل شیخ مشہور ہیں اور والدہ صاحبہ نے فرمایا تھا کہ ہم شیخ قریشی ہیں۔ والد صاحب مرحوم بھی اپنے آپ کو شیخ لکھا کرتے تھے۔ دیگر حضرات کے ناموں کے ساتھ لفظ شیخ استعمال ہوتا رہا ہے۔ والدہ صاحبہ مرحومہ قاضیوں کے خاندان کی تھیں اور بعض اہل برادری جو پرانے زمانے سے مشہور چلے آتے تھے۔

ان لوگوں سے بھی ہم لوگوں کی رشتہ داریاں ہیں لیکن الحمد للہ سب سے بڑا شرف جو احقر کو بفضلہ تعالیٰ حاصل ہے وہ یہ ہے کہ حضرت اشرف المخلوقات علیہ الوف الصلوٰت والتحیات جیسے اشرف الرسل کی امت مسلمہ میں ہوں اور حضرت اشرف الزمن جیسے اشرف المشائخ کے ارادت مندوں میں ہوں بقول بقول احقر ؎

ہے احد معبود اپنا اور نبی خیر الوریٰ
شیخ بھی ہے قطب دوراں میں تو اس قابل نہ تھا

قطعہ

کیا میرے گناہوں کا اللہ ٹھکانا ہے!

اور ہائے غضب اک دن منہ تجھ کو دکھانا ہے

کر رحم کہ نسبت ہے سرکارِ دو عالم سے

اور اس سے میں بیعت ہوں جو قطب زمانہ ہے

اللہ تعالیٰ احقر کے ان سب شرفوں کو زندہ رکھے اور ایمان کامل پر خاتمہ فرما کر جنت الفردوس میں ابدالآباد اپنے قرب و دیدار کے شرف سے مشرف فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

تالیف اشرف السوانح کا شرف مجھ جیسے ناکارہ و آوارہ کو حاصل ہو جانا محض موہبت خداوندی ہے ورنہ ؎

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

نسیم صبح تیری مہربانی

اس کے اسباب ایسے مجتمع ہو گئے کہ جن کا پہلے سے کسی کو گمان بھی نہ ملتا تھا۔ احقر نے قبل از وقت پنشن کے قواعد کو غلط سمجھ کر پنشن کی درخواست دے دی جو نامنظور ہو گئی تھی لیکن چونکہ اس سلسلہ میں تحقیق ہو گئی تھی کہ میں نصف تنخواہ پر دو سال چار ماہ کی رخصت کا مستحق ہوں مجھے بعد نامنظوری درخواست دفعتہً یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر پنشن نہ مل سکی تو کم از کم اتنے دن کی رخصت ہی سے لے لوں کیونکہ اگر پنشن ہو جاتی تو اس وقت سے بھی نصف تنخواہ بلکہ شائد نصف سے بھی کم ملتی۔ لہٰذا میں نے ۲ سال چار ماہ کی رخصت کی درخواست دیدی جو بفضلہٖ تعالیٰ منظور ہو گئی اور میں نے ہمیشہ اس کا تجربہ کیا ہے کہ جب کبھی حضرت والا کی خدمت میں حاضری کے لئے درخواست دی باوجود قوی موانع کے بھی ہمیشہ منظور ہی ہو گئی۔ درخواست سے قبل ہی میں نے ویسے ہی محض نیک فال لینے کی غرض سے جسکی بشرط صحت عقیدہ یعنی عدم اعتقاد جازم شرعاً جائز ہے۔ حضرت حافظ علیہ الرحمۃ کے دیوان کو کھولا تو سر صفحہ پر یہ اشعار نکلے۔

درخم زلف تو آویخت دل از چاہ زنخ

آہ کز چاہ بروں آمدہ در دام افتاد

من ز مسجد بہ خرابات نہ خود افتادم

آں ہم از روز ازل حاصل فرجام افتاد

حسن اتفاق سے ہو بہو وہی ہوا جو ان شعروں کا حاصل تھا یعنی میں نے چاہا تھا کہ ملازمت کی قید سے نکل کر یکسوئی کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں حاضر رہ کر خوب اللہ اللہ کروں گا لیکن یہاں آکر کچھ ہی عرصہ کے بعد بلا شان و گمان منجانب اللہ دفعۃً اشرف السوانح کا کام چھڑ گیا جسکی وجوہ و دواعی تمہید سوانح میں عرض کی جا چکی ہیں اور پھر یہ کام اتنا پھیلا۔ اتنا پھیلا کہ ساری رخصت ہی اس میں تمام ہوگئی اور مذکورہ بالا اشعار میں سے پہلے شعر کا یہ مصرعہ حرف بحرف صادق ہوگیا۔

آہ کز چاہ بروں آمد در دام افتاد

کیونکہ میں ایک بالکل لاابالی آزاد مزاج آشفتہ خیال اور دماغی کام سے کوسوں بھاگنے والے اور جان چرانے والا شخص ایسے طویل علمی منظم اور مسلسل کام میں آپھنسا جو واقعی میرے لئے ایک دام ہی تھا لیکن الحمد للہ دام محبوب تھا۔

چنانچہ جب میں نے قبل شروع رخصت حضرت والا کی خدمت میں بحوالہ مصرعہ مذکورہ بالا اپنے عریضہ میں ایک گونہ تشویش سی لکھی کہ کہیں چھٹی لے کر خدانخواستہ کسی دام بلا میں تو گرفتار نہ ہو جاؤں گا تو حضرت والا نے اسی عنوان سے تسلی فرمائی تھی کہ اس دام سے دام محبت مراد ہے جو بہت محبوب دام ہے اور اس شعر کا مصداق ہے ؎

اسیرش نخواہد رہائی ز بند

شکارش نجوید خلاص از کمند

اس وقت اشرف السوانح کے کام کا کہیں وہم و گمان بھی نہ ہوا تھا۔ یہ تو اوپر کے شعروں میں سے پہلے شعر کے متعلق کلام ہوا اور دوسرے شعر میں تو گویا احقر کا نام تک موجود ہے یعنی لفظ خواجہ اور اس کا مصرعہ

کار ما با رخ ساقی و لب جام افتاد

تو بالکل صریح ہے کیونکہ رات دن حضرت والا اور انضباط ملفوظات حضرت والا ہی سے کام رہا اور تیسرا شعر یعنی

من ز مسجد بخرابات نہ خود افتادم
ایں ہم از روز ازل حاصل فرجام افتاد

بھی بالکل صریح ہے کیونکہ مقصد تو تھا دن رات اللہ اللہ کرنے کا جو گویا مسجد کا کام ہے لیکن وقت گزر گیا۔ سوانح کے کام میں اور گو یہ کام بوجہ اس کے کہ اس کا نفع متعدی ہے دوسرے کام سے جس کا نفع لازم ہے افضل ہو لیکن مقصودیت کے لحاظ سے اور ظاہر میں تو وہی افضل ہے۔ نیز سوانح کا کام عشق و محبت کا کام تھا جس کو حضرت حافظ اپنی اصطلاح میں خرابات سے تعبیر فرماتے ہیں۔ اسی طرح میں دوسرے مصرعہ کو اس پر محمول کرتا ہوں کہ روز ازل ہی سے اللہ تعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ اشرف السوانح مرتب ہو کر سالکین کے لئے مشعل راہ کا کام دے اور قیامت تک کے لئے محفوظ ہو جائے جس کا غیب سے سامان ہو گیا غرض یہ شرف احقر کی قسمت میں ازل ہی سے لکھ دیا گیا تھا۔ الحمد للہ حمداً کثیراً اللہ تعالیٰ مقبول فرمائے۔

عزیز الحسن مجذوب :- اشرف السوانح جلد سوم (لاہور ۱۹۶۰ء) صفحات ۴۸۰ تا ۴۸۵

حضرت خواجہ صاحب
اپنے
مرشد حضرت حکیم الامت قدس سرہ
کی نظر میں

حضرت خواجہ عزیزالحسن مجذوب کا اپنے شیخ حضرت تھانوی قدس سرہ کے ہاں کیا مقام تھا اور حضرت تھانوی خواجہ صاحب سے کس طرح کا سلوک فرماتے تھے۔اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ حضرت تھانوی اپنے ملفوظات میں مختلف حضرات کا جب تذکرہ فرماتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب (مولوی محمد شفیع۔ مولوی محمد طیب۔ مولوی ظفر احمد۔ مولوی شبیر علی صاحب لیکن خواجہ صاحب کو اکثر "ہمارے خواجہ صاحب" سے پکارتے تھے۔ ایک مرتبہ خواجہ صاحب کے متعلق فرمایا "اس کے ساتھ ہی یہ امر عجیب واقع ہوا کہ جامع ملفوظات مجی خواجہ عزیز الحسن صاحب نے مدت سے محض اپنے دین کی حفاظت کے لئے اپنے کو محکمہ تعلیم میں لئے جانے کی تحریک کر رکھی تھی" ①

ایک مرتبہ حضرت تھانوی گفت گو فرما رہے تھے تو درمیان میں حضرت خواجہ صاحب کا ذکر آیا تو ان کی بہت تعریف کی اور بہت سے اوصاف بیان کئے۔ فرمایا خواجہ صاحب سراپا دین اور عامل بالعزیمت، قانع۔ متواضع خلیفہ مجاز ہیں۔ دنیا کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہیں۔ صاحب حال حب فی اللہ رکھنے والے ہیں میرٹھ میں مجھ کو سوڈا واٹر پلایا گیا اس سے پھندا ایسا لگا کہ دم کے دم میں گویا خاتمہ ہی کی صورت ہو گئی تھی۔ خواجہ صاحب بھی اس وقت موجود تھے۔ جب یہ مرحلہ گذر گیا تو فرماتے ہیں کہ اس وقت رنج تو مجھے جتنا ہوا ظاہر ہے مگر میں نے اپنے دل کو سمجھایا کہ جمعہ کا دن ہے آج کی موت بھی اچھی ہے اور خاتمہ بالخیر ہونا بڑی دولت ہے یہ میرے ہی منہ پر بلا تکلف کہہ ڈالا۔ ظاہر اًرنج وہ بات ہے مگر مجھے

---

① عزیز الحسن مجذوب۔ حسن العزیز۔ تھانہ بھون۔ ص

اس کی بڑی قدر ہوئی کہ دین ان کی طبیعت پر غالب ہے طبعی رنج کو بھی دین کے خیال نے دبا دیا تھا۔ میں تو دنیا داروں کے مجمع میں بھی لوگوں کے مذاق کی رعایت سے الفاظ بولتا ہوں مگر خواجہ صاحب دنیاداروں کے مجمع میں بھی وہی الفاظ بولتے ہیں کہ یہ حلال ہے یہ حرام ہے۔ کاش ان کے والدین ان کو علم دین پڑھاتے۔ ایسے لوگ علم دین کے لائق ہیں۔ خواجہ صاحب کی دین داری ہے مولوی عبدالغنی اور دیگر معاصرین سے ان کو بڑی محبت ہے ورنہ معاصرین سے محبت نہیں ہوتی۔" [۱]

۱۹۱۶ء میں حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک سفر فرمایا۔ اس سفر میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت قدس سرہ کے ساتھ شریک نہ تھے اس پر افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ "کیا کہئے خواجہ صاحب ساتھ نہ ہوئے ورنہ اس سفر میں بڑا لطف رہتا۔"

ایک مرتبہ فرمایا "ڈپٹی کلکٹری کے زمانہ میں وہ مقدمات میں مجھ سے مشورے لیا کرتے تھے اور شرعی حکم پوچھا کرتے تھے اور جزئیات پر گفتگو کرتے، بغیر اس کے ان کو اطمینان نہ ہوتا تھا۔ یہ کس قدر ہمت کی بات ہے۔ ہم تو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ کسی پر زیادتی نہ کرنا مگر وہ ایک ایک جزئی پر بحث کرتے ہیں اور جب بتلایا جاتا ہے تو جب تک تشفی ہو نہیں جاتی اس کے وجوہ پوچھتے چلے جاتے ہیں وہ اگرچہ عالم نہیں ہیں مگر بہت واقف اور بہت محتاط ہیں۔ ہم تو تاویل بھی کر لیتے ہیں وہ عزیمت ہی پر عمل کرتے ہیں۔" [۲]

ایک مرتبہ ایک سفر میں ایک اسٹیشن پر نماز فجر کا وقت آیا۔ حضرتؒ نے خواجہ صاحب سے فرمایا "صاحب بہادر کا وضو ہے؟" خواجہ صاحب نے فرمایا "میں صاحب بہادر کیسے ہوا؟" فرمایا "اس لقب کے لائق مجمع میں آپ ہی ہیں اور تو غربا ہیں۔" اس پر خواجہ صاحب بہت ہنسے۔ [۳]

---

[۱] مولوی محمد یوسف۔ حسن العزیز (جلد چہارم) مظفر نگر ص ۱۹۱ تا ۱۹۲

[۲] حسن العزیز جلد چہارم ص ۱۴۷۔

[۳] حسن العزیز جلد چہارم ص ۵۲۔

ایک مرتبہ حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا "خواجہ صاحب کی یہ بات مجھ کو پسند آئی کہ کسی شخص نے ان سے ان کے نسب کے متعلق پوچھا کہ آپ کون ہیں؟ انہوں نے کہا مجھ کو تحقیق نہیں مگر قرآن سے تو اتنا معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی شریف قوم سے ہوں"۔ ؎1

حضرت تھانوی قدس سرہ کے ایک اور خلیفہ ارشد حضرت مولانا عبدالباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ دونوں حضرات کے تعلقات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں "یہ جانتا ہوں کہ حضرت خواجہ صاحب اور حضرت حکیم الامت کا تعلق بس وہی تھا جو امیر خسرو اور حضرت سلطان جی رحمہم اللہ کا تھا۔ وہ (خواجہ صاحب) حضرت کے مرید و محب ہی نہ تھے بلکہ محبوب بھی تھے جس کے مناظر کبھی کبھی مجلس میں دیکھنے میں آتے تھے۔ ایک مرتبہ میں حاضر تھا اور خواجہ صاحب پر حال طاری تھا بس مست ہو کر اپنا کلام جو سنانا شروع کیا تو دیر تک حضرت تھانوی سر جھکائے سنتے رہے۔ پھر جب دیکھا کہ ہمارے خواجہ صاحب کا جوش بڑھتا ہی جارہا تھا تو نہایت محبت و شفقت کے انداز میں بس اتنا فرمایا کہ "بس اب بس کیجئے" باقی اصل چیز تو قابل صد رشک خواجہ صاحب کا قال نہیں حال تھا"۔ ؎2

حضرت تھانوی نے فرمایا "خواجہ صاحب جب کبھی مجھ کو یہ شعر یاد آجاتا ہے تو کم از کم تین مرتبہ پڑھے بغیر سیری نہیں ہوتی"۔ ؎3

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا، اب تو خلوت ہو گئی

حضرت حکیم الامت نے ایک مرتبہ خواجہ صاحب کی شاعری کے متعلق فرمایا۔
"خواجہ صاحب تصوف کے دقائق و غوامض کو اپنے اشعار میں ادا کرتے ہیں"۔ ؎3

مندرجہ بالا شعر کے متعلق ایک بار خواجہ صاحب سے فرمایا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا

؎1 الافاضات الیومیہ جلد پنجم ص ۲۱۰

؎2 مکتوب گرامی حضرت مولانا عبدالباری صاحب (مجاز بیعت حضرت حکیم الامت مولانا تھانویؒ)

؎3 ماہنامہ صدائے اسلام اکتوبر ۱۹۷۰ء صفحہ ۱۸

تو آپ کو اس شعر پر دیتا۔"

ایک بار حضرت حکیم الامتؒ نے آپ کو کسی بے عنوانی پر ظہر کے بعد کی مجلس میں ڈانٹا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد، نمازیوں کے منتشر ہونے کے بعد غایت شفقت سے خاص طور پر خواجہ صاحب ہی سے فرمایا میں جنگل میں ٹہلنے جا رہا ہوں کیا آپ بھی ساتھ چلیں گے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ جی ہاں۔ اس کے بعد خواجہ صاحب کو لے کر سیر کے لئے چلے گئے۔ راستہ میں خواجہ صاحب سے فرمایا" اس اظہارِ خصوصیت کا یہ منشا تھا کہ جن لوگوں کے سامنے ڈانٹا گیا تھا، ان کے قلب میں جو بے وقعتی پیدا ہوئی تھی اس کا تدارک ہو جائے (۱)

ایک مرتبہ خواجہ صاحب تھانہ بھون تشریف لائے۔ کچھ روز قیام کے بعد واپس جانے لگے تو کچھ نقد ہدیہ پیش کرنے کے لئے اپنی اچکن کی اوپر والی جیب سے روپیہ نکالنے لگے لیکن چونکہ جیب تنگ تھی اس لئے روپیہ نکالنے میں تکلف ہوا اور کچھ دیر لگی۔ حضرت تھانوی قدس سرہ نے اس پر مزاحاً فرمایا کہ روپیہ نہیں نکلتا تو اچکن ہی اتار کر مجھے دے دیں میں خود نکال کر لوں گا۔ (۲)

ایک بار سفر دہلی میں خواجہ صاحب حضرت تھانوی قدس سرہ کے ہمراہ تھے۔ ایک روز حسب معمول صبح کی سیر کے لئے تلاوت فرماتے ہوئے تشریف لے گئے جو احباب سفر میں ساتھ تھے ان کو اس وقت ساتھ چلنے کی ممانعت فرما دی۔ سب کے ہمراہ خواجہ صاحب بھی جانے لگے تو خواجہ صاحب کو واپس بلا لیا۔ راستہ میں خواجہ صاحب سے فرمایا کہ" ممانعت تو ان کے لئے تھی جن سے بے تکلفی نہیں ہے۔ پھر فرمایا کہ اگر ہر صورت یہ چاہنے لگے کہ میرے ساتھ ہی کا تعلق رکھا جائے تو یہ اس کی حماقت ہے۔ (۳)

۱؎ خواجہ عزیز الحسن مجذوب۔ اشرف السوانح۔ جلد دوم ص۱۳۲

۲؎ اشرف السوانح جلد دوم ص۱۴۲

۳؎ " " " ص۱۴۱

وفات سے دو چار روز قبل بہت ہی عجیب و غریب مضامین بیان فرمائے پھر خواجہ صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا "خواجہ صاحب یہ باتیں لکھنے کی ہیں، خواجہ صاحب یہ باتیں پھر نہ سننے میں آئیں گی کیونکہ میں دیکھتا ہوں کہ کہیں اس کا اہتمام نہیں" اور یہ بھی فرمایا کرتے ۔

بیدل خستہ کو پاؤ گے کہاں   کر لو انکی مہمانی چند روز

یہ مصرعہ بھی اس وقت موزوں فرمایا تھا۔

؏   رانڈ ہو جائیں گے قانون و شفا میرے بعد

حضرت خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ اپنے شیخ سے فرمایا کہ حضرت جب تک آپ کی خدمت میں حاضر رہتا ہوں تو قلب کی حالت بہت اچھی رہتی ہے اور جب یہاں سے چلا جاتا ہوں تو رفتہ رفتہ حالت خراب ہو جاتی ہے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ نے فوراً نہایت لطف کے ساتھ تسلی فرمائی کہ "پھر حرج ہی کیا ہے۔ آپ کپڑے میلے کر دیتے ہیں۔ دھوبی ان کو دھو دیتا ہے۔ آپ پھر میلے کر دیتے ہیں، دھوبی پھر ان کو دھو دیتا ہے۔"(۱)

خواجہ صاحب کو ہجوم وساوس کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی۔ حضرت تھانوی قدس سرہ سے ذکر کیا تو حضرت نے فرمایا "میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ اللہ تعالٰی نے آپ کو علم اعتبار عطا فرمایا ہے" اس کے بعد علم اعتبار کی حقیقت بیان فرمائی۔ حضرت خواجہ صاحب کو اس بشارت پر کہ علم اعتبار عطا ہوا ہے بڑی مسرت ہوئی۔ جب کچھ عرصہ کے بعد یہ حالت فرو ہو گئی تو خواجہ صاحب نے اس فقدان پر حسرت کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت تھانوی نے فرمایا "کچھ غم نہ کیجیے۔ دیکھئے درخت پر پہلے پھول آتے ہیں جو جھڑ جاتے ہیں پھر پیچھے پھول آتے ہیں جن سے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ افسوس کی بات نہیں اس قسم کے تغیرات تو اسی طریق میں لازم عادی ہیں۔ علم اعتبار کیا چیز ہے۔ انشاء اللہ آئندہ اس سے بھی بڑھ کر اور دولتیں عطا ہوں گی۔ کچھ فکر نہ کیجئے۔"(۲)

---

(۱)   اشرف السوانح جلد دوم صـ۱۶۲

(۲)   اشرف السوانح جلد دوم صـ۱۳۲

ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب حضرت تھانوی قدس سرہ کی مجلس میں حاضر تھے حضرت والا کسی کام سے اٹھے۔ مجذوب صاحبؒ نے فرش پر رکھی ہوئی دوات اٹھا کر کچھ فاصلے پر رکھ دی حضرت والا جب اپنے نیچے تلے قدموں کے ساتھ واپس آئے تو دوات کو ٹھوکر لگی اور وہ الٹ گئی حضرت نے برہم ہو کر پوچھا یہ کس کی حرکت ہے؟ یہ دوات یہاں راستے میں کس نے رکھدی؟ حضرت مولانا محمد مبین صاحب نے فرمایا: مجذوب صاحب نے، فرمایا بس مجذوب صاحب مجھ سے بات نہ کیجئے جب حضرت گھر جانے کے لئے اٹھے تو پانی کا گلاس دائیں ہاتھ میں اور جوتا بائیں ہاتھ میں اٹھائے ہوئے تھے حضرت خواجہ صاحب آواز سن کر گنگنائے اور آپ کی آواز حضرت والا کے کانوں تک پہنچ گئی۔ حضرت والا نے ڈانٹ کر پوچھا کون ہے حضرت خواجہ صاحب لپک کر سامنے آئے اور دست بستہ یہ شعر پڑھا ؎

کس کی مجال بات جو ساقی سے کر سکے

ایک ہاتھ میں ہے جوتا ایک ہاتھ میں پیالہ

حضرت والا سن کر مسکرائے اور مجذوب صاحب کو گلے لگا لیا۔(۱)

ایک مرتبہ آپ نے حضرت قدس سرہ کو مکتوب لکھا۔ حضرت کی والہانہ عقیدت اور محبت کی بنا پر خط کافی طویل ہو گیا۔ آخر میں طوالت مضمون کی معذرت فرمائی۔ حضرت تھانویؒ نے جواباً فرمایا "محبوب کی زلفیں جتنی دراز ہوں پسند ہوتی ہیں"۔ (۲)

حضرت خواجہ صاحب نے ایک خط میں جس میں زیادہ تر غزلیں ہی تھیں جو آپ نے بحالت شدت ذوق و شوق تصنیف کی تھیں جن سے پابندی معمولات میں باوجود عزم بالجزم کے سخت خلل واقع ہو گیا تھا جس کی شکایت بھی خط میں کی گئی تھی اس کے جواب میں حضرت نے تحریر فرمایا:

"غزل نامہ جو کہ کشف استعداد فطری کے اعتبار سے ازل نامہ ہے پہنچ کر وجد و طرب میں لایا۔ خدا تعالیٰ آپ کے سب مقاصد پورے کرے۔ بجز اضاعت وقت میں بھی اطاعت بخت کا مسئلہ

---

(۱) بروایت حضرت حکیم محمد ابراہیم رزمی صاحب

(۲) بروایت حکیم الدار الحق تھانوی۔ (طبیب خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون حال مقیم لطیف آباد حیدرآباد سندھ)

حل ہوا کہ انسان تقدیر حق کے سامنے عاجز ہے کہ ارادہ تو کیا تھا ضبطِ اوقات کا، مگر ہو گیا خبطِ اوقات۔ انشاء اللہ اس مسئلہ کا منکشف ہونا بھی ترقی کا زینہ ہوگا۔ آشفتہ و آشفتہ کن، اشرف علی

"ایک بار آپ نے حضرت قدس سرہ سے فرمایا ایک مرض تو معمولی مرض ہوتا ہے۔ کھانسی نزلہ زکام، بخار اور ایک مرض ہوتا ہے تپ دق۔ میں تپ دق کا مریض ہوں لہٰذا بہت زیادہ محتاج توجہ ہوں۔ اس پر حضرت نے فرمایا "مبارک ہو یہ تو نسبت باطنی کی علامت ہے کیونکہ نسبت باطنی بھی تپ دق کی طرح رگ رگ میں سرایت کر جاتی ہے اور کبھی زائل نہیں ہوتی۔" سبحان اللہ کس محبت سے تشفی فرمادی۔

ایک بار خواجہ صاحب نے فرمایا کہ حضرت میرے قلب کی بھی عجیب ڈانواں ڈول حالت ہے۔ فرمایا "اصل قلب تو آپ ہی کا ہے کیونکہ قلب کے معنی ہیں جو ایک حالت پر نہ رہے بلکہ منقلب ہوتا رہے۔"[1]

اہلِ محبت ہی اس جواب سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

خواجہ صاحب ہجوم وساوس سے بہت پریشان رہتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں ایمان کے متعلق بھی تردد پیدا ہو گیا تھا بالآخر گھبرا کر ایک عریضہ شیخ عالی مقام کو تحریر کیا جس میں سب وساوس تحریر کر دیئے اور عرض کیا "اب حضرت والا ہی تحریر فرمائیں کہ مجھ میں ایمان ہے یا نہیں؟ یا نعوذ باللہ خدانخواستہ میں اس دولت سے محروم ہی ہوں؟ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ یہ فیصلہ ایک مجدد اور ایک قطب الارشاد کے یہاں سے ہوگا اور اگر وہاں سے بھی مایوسی ہوئی تو میرا ٹھکانہ کہیں نہ ہوگا۔ بڑی جرأت کرتے ہوئے توکلاً علی اللہ یہ سوال کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی خیر رکھے۔"

اس پر حضرت قدس سرہ نے ایمان کی بشارت دے کر یہ شعر تحریر فرمایا ؎

کوئے نومیدی مرو کامیدہاست
سوئے تاریکی مرو خورشیدہاست

خواجہ صاحب نے یہ بھی لکھا کہ اگر میرے ناگفتہ بہ حالات معلوم فرما کر حضور نے مجھ کو چھوڑ دیا اور

---

[1] اشرف السوانح جلد دوم صفحہ ۶۴

نظر توجہ ہٹائی تو پھر یہ سمجھ لیجئے کہ سوائے جہنم کے کہیں میرا ٹھکانا نہ ہوگا" اس پر حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا معاذ اللہ کرے توجہ کیوں ہٹانے لگا۔

بندۂ پیر خراباتم کہ لطفش دائم است
زانکہ لطف شیخ و زاہد گاہ ہست گاہ نیست [۱]

ایک بار حضرت خواجہ صاحب حضرت تھانوی کی خدمت سے رخصت ہونے لگے تو ان کی حالت بہت غیر ہونے لگی تو حکیم الامت نے نہایت شفقت کے لہجہ میں فرمایا کہ "دلگیر ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ الحمد للہ سرمایۂ تسلی ہر وقت پاس ہے یعنی تعلق مع اللہ" ماشاء اللہ جواب کیا ہے محبت و معرفت کا ایک جام سرشار ہے!

ایک بار حضرت خواجہ صاحب چھٹی لے کر حضرت حکیم الامت قدس سرہ کی خدمت میں بغرض اصلاح خانقاہ تشریف لائے اور آتے ہی ایک پرچہ پر اپنا ایک شعر لکھ کر پیش کیا ؎

نہیں کچھ اور خواہش آپ کے در پر میں آیا ہوں
مٹا دیجئے مٹا دیجئے یہاں مٹنے کو آیا ہوں

حضرت قدس سرہ نے فوراً نہایت وثوق کے ساتھ فرمایا:

" انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا" [۲]

شیخ کا یہ اعتماد مرید کے حق میں فائز المرام کی ضمانت ہے۔

حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے خواجہ صاحب کے متعلق ، ربیع الاول ۱۳۴۲ھ کو خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ایک وعظ کے دوران فرمایا " خیال تو بیان کا چند روز سے تھا مگر اب ایک سبب یہ بھی داعی ہوا کہ آج کل کچھ عزیز مہمان (مراد حضرت خواجہ صاحب) مجتمع ہیں جو عدداً قلیل ہیں مگر چونکہ

---

[۱] اشرف السوانح جلد دوم ص ۱۶۷

[۲] اشرف السوانح جلد دوم ص ۱۶۸

ان میں ایک کیفیت شوقیہ ہے اور دین کے ساتھ تعلق ہے اس لئے کیفیۃً ان کو کثیر ہی سمجھتا ہوں"[1]

جامع العلوم کانپور میں ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۶ھ کو وعظ کرتے ہوئے خواجہ صاحب کا تذکرہ یوں فرمایا "ہمارے مجمع میں ایک مجذوب ہیں۔ اللہ اور اہل اللہ کا نام سنتے ہی اس قدر چلاتے ہیں کہ تاب نہیں رہتی مگر نماز میں کبھی چیخ نہیں نکلتی"۔[2]

پانی پت میں درگاہ بوعلی شاہ قلندر پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ۲۵ صفر ۱۳۳۷ھ کو وعظ فرما رہے تھے۔ دوران وعظ فرمایا "ہمارے ایک دوست نے ناجائز ہونے کی بنا پر ڈپٹی کلکٹری چھوڑ دی ہے تو اب سب لوگ انہیں لتاڑتے ہیں کہ عقل ہی ماری گئی ہے۔ ہم کہتے ہیں تمہاری عقل ماری گئی ہے جو اس کو خلاف عقل کہتے ہو۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

مدرسہ اشاعت العلوم بریلی میں ۱۲ ذیقعدہ ۱۳۲۹ھ کو دوران وعظ فرمایا "ہمارے ایک دوست ہیں ڈپٹی کلکٹر جس روز سے ان پر یہ حالت ہوئی دنیا سے دل سرد ہو گیا ہے۔ اب ان کو صرف ایک ہی سبق یاد رہ گیا ہے (یعنی یاد الٰہی) گویا ان کا یہ حال ہے۔

ما ہر چہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
الا حدیث یار کہ تکرار می کنیم (۳)

حضرت حکیم الامت قدس سرہ ایک مرتبہ بھرت پور تشریف لے گئے خواجہ صاحب بھی ہمراہ تھے۔ وہاں آپ کے چند وعظ ہوئے جن کو خواجہ صاحب نے قلم بند فرما لیا۔ راستہ میں وہ بیگ جس میں مواعظ کا مسودہ تھا، چوری ہو گیا۔ خواجہ صاحب کو ان مواعظ کے گم ہونے کا بے حد صدمہ اور رنج ہوا۔ اس پر حضرت نے خواجہ صاحب کی دل جوئی کے لئے فرمایا۔

---

(۱) المورد الفرسخی فی المورود البرزخی ص۱۵

(۲) المربیع فی الربیع ص۱۰

(۳) فضائل العلم والخشیۃ ص۵۵

"خواجہ صاحب۔ سر سلامت رہے تو ٹوپیاں بہت ہیں یعنی واعظ زندہ رہے تو وعظ بہت ہوں گے" (۱)

خواجہ صاحب نے جب حضرت شیخ کے ملفوظات جمع کرنے شروع کئے تو حضرت تھانوی نے فرمایا کہ کیا نام رکھیئے گا؟ خواجہ صاحب نے کہا کہ حضور آپ ہی تجویز فرمایا کہ ایسا نام مجھے تو نہیں رکھنا چاہیئے لیکن ایک نام بہت اچھا ذہن میں ہے حسن العزیز خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کیا کروں جیسا جی چاہتا ہے ویسا ضبط نہیں ہو سکتا کیونکہ حضور کی زبان فیض ترجمان سے تو علوم و معارف کے دریا کے دریا امنڈے چلے آتے ہیں اور یہ بے بضاعت کس طرح لکھے اور کیا کیا لکھے سخت الجھن ہوتی ہے ہنس کر فرمایا" جہاں ایسی الجھن ہو بس یہ شعر لکھ دیا کیجئے۔

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین بہار تو ز داماں گلہ دارد (۲)

خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ حضرت میرا ارادہ ہے کہ شعر کہنے سے توبہ کر لوں اور میں نے اس کے متعلق فال دیکھی تو یہ شعر نکلا ؎

چند گوئی نظم و نثر راز فاش
خواجہ یک روز امتحان کن گنگ باش

فرمایا اچھا ہے یہ قطعہ رسالہ الامداد کے آخر میں لکھ دیں اچھا ہے۔ دوسروں کو نفع ہوگا مگر کہیں آپ یہ فن نہ بھول جائیں۔ یہ شاعری بھی کمال ہے جس کا بھولنا ٹھیک نہیں۔ پھر خواجہ صاحب نے عرض کیا کہ میرا ارادہ ہے کہ شعر پڑھنے سے بھی توبہ کر لوں فرمایا نہیں ایسا نہیں شعر پڑھنے سے جوش و حرارت ہوتا ہے البتہ شعر تصنیف کرنے میں دماغ خرچ ہوتا ہے۔ یہی دماغ کسی اور بات میں صرف ہو تو اچھا ہے۔ (۳)

---

(۱) تاسیس البنیان علی تقوی من اللہ و رضوان صـ۳۱
(۲) صوت اسلام صـ۱۲ جون ۱۹۷۰ء
(۳) حسن العزیز حصہ سوئم

ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے حضرت قدس سرہ سے عرض کی کہ حضرت اب شعر سے دلچسپی نہیں رہی اور از راہ مذاق فرمایا "اچھا ہے ورنہ در بوگی ہوجاتی"۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی ایک واقعہ تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں قیام خانقاہ میں جب حضرت خواجہ رحمۃ اللہ علیہ کا جوش شاعری بہت بڑھا ہوا تھا۔ ہر وقت شعر و شاعری کا شغل تھا۔ میں نے خود حضرت والا کی زبان سے سنا فرمایا کہ میں نے خواجہ صاحب کو بلایا اور اپنے سامنے بٹھا کر کہا کہ شاعری سے توبہ کیجئے خبردار آئندہ شاعری نہ کیجئے اور مجھ سے وعدہ کیجئے کہ آئندہ اس شغل کو ترک کر دیں گے۔ پھر اس پر فرمایا کہ جب میں ان سے توبہ کرا رہا تھا تو دل میں دعا بھی مانگتا جاتا تھا کہ یا اللہ ان کی توبہ قبول نہ کیجئے (حضرت ڈاکٹر عبدالحئی)

ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ساتھ ایک سفر میں تھے۔ خواجہ صاحب کا بستر بہت لمبا چوڑا بہت روئی دار اور موٹا تھا۔ اس کا نام حضرت قدس سرہ نے خواجہ صاحب کا جہاز رکھا تھا۔ خواجہ صاحب نے بمشکل اس بستر کو بستر بند سے باندھا۔ پھر بھی اس کی بندش سیدھی نہ ہوئی حضرت والا نے فرمایا کہ "دیکھئے خواجہ صاحب کے بستر کی بندش ہی بتلا رہی ہے کہ خواجہ صاحب چشتی ہیں جب بستر اٹھانے لگے تو اس میں سے گھڑی نکل پڑی۔ اس پر حضرت قدس سرہ نے ایک بات فرمائی جس کو یاد کر کے خواجہ صاحب بہت ہنسا کرتے تھے وہ بات یہ تھی کہ جب راستہ ہی میں گھڑی نکل پڑی تو حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ "خواجہ صاحب یہ اسقاط قبل از وقت ہوا ہے"۔ (۱)

خواجہ صاحب نے حضرت قدس سرہ سے فرمایا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ توکل کروں اور سب تعلقات چھوڑ کر اللہ اللہ کروں۔ اس پر حضرت قدس سرہ نے ہنس کر فرمایا کہ خواجہ صاحب جلدی نہ کیجئے۔ جب سب اولاد کی شادیاں ہوجائیں اور آمد بھی بند ہوجائے تو اس وقت مناسب ہے۔ (۲)

ایک روز صبح کو ہوا خوری سے واپس آکر حضرت فرودگاہ میں حسب معمول بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت والا کی طبیعت بہت بشاش معلوم ہوتی تھی۔ کسی تذکرہ میں فرمایا کہ اس طریق میں بڑی بڑی نازک باتیں

---

(۱) حسن العزیز جلد چہارم ص۲۵۵۔

(۲) حسن العزیز جلد چہارم ص۳۹۹۔

پیش آتی ہیں اور بہت غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک اصول لاکھوں روپے کا ہے اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ حضرت خواجہ صاحب ایک طرف کھڑے ہوئے تھے حضرت نے خاص طور سے ان کو پکار کر فرمایا "خواجہ صاحب آپ بھی سُن لیجئے کس قدر کام کی بات ہے"۔ اس سے حضرت خواجہ صاحب کی خصوصیت صاف ظاہر ہے"۔ [۱]

حضرت قدس سرہ نے فتح پور میں وعظ فرمایا۔ حضرت خواجہ صاحب اس وعظ میں شرکت نہ کر سکے۔ بعد میں حضرت خواجہ صاحب آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے "آپ وعظ فتح پور میں بہت یاد آئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخاطبت کا اصل اہلِ نگاہ اشرف میں خواجہ صاحب ہی تھے۔ جن دنوں بہاولپور میں قادیانی مقدمہ چل رہا تھا۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ بہاولپور تشریف لائے۔ واپسی پر حضرت خواجہ صاحب اپنا اور حضرتِ والا کا سامان انٹر کلاس کے ڈبے میں رکھ رہے تھے۔ گرمی کا موسم تھا۔ خواجہ صاحب جیسا لطیف البدن انسان پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ حضرت والا نے یہ دیکھ کر خواجہ صاحب کو پنکھا جھلنا شروع کر دیا۔ خواجہ صاحب کے لئے یہ صورتحال ناقابلِ برداشت تھی کہ شیخ مرید کو پنکھا جھلے۔ چنانچہ بے تابانہ حضرت والا سے درخواست کی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ کوئی دیکھ تھوڑی ہی رہا ہے" خواجہ صاحب نے کہا "دیکھ رہا ہے"۔ فرمایا کون؟ خواجہ صاحب نے کہا "جس کی وجہ سے میں آپ کا ادب کرتا ہوں۔ حضرت والا نے جب دیکھا کہ مرید روحانی کرب محسوس کر رہا ہے تو پنکھا جھلنا بند کر دیا۔ [۲]

حضرت خواجہ صاحب حکیم الامت کی مجلس میں تشریف فرما تھے اور حضرت نے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کا تذکرہ فرمایا کہ حضرت گنگوہ شریف میں حدیث شریف کا درس دیتے تھے جو طالب علم عربی دان ہوتا اس کو کھانا ملتا تھا۔ ایک شخص کہیں باہر کے رہنے والے حضرت کے درس میں شرکت کے

---

[۱] حسن العزیز جلد سوم ص ۱۱

[۲] بروایت حضرت سید ابراہیم رزمی صاحب۔

لئے تشریف لائے اور حضرت سے درس میں شرکت کی اجازت مانگی جس پر حضرت نے دریافت کیا کہ تم عربی پڑھے ہوئے ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں عربی نہیں جانتا۔ فرمایا آپ کو کھانا نہیں ملے گا اس نے عرض کیا کہ آپ درس میں شرکت کی اجازت دیں کھانا نہ دیں۔ کھانا کہاں سے کھاؤ گے فرمایا میرا کام علم حاصل کرنا ہے کھانا وہ خود دیں گے اگر نہیں دیں گے تو اپنی جان واپس لے لیں گے۔ اسی وقت ایک شخص کہیں باہر کا آیا اور حضرت گنگوہی سے کہا کہ مجھے فلاں بستی سے فلاں رئیس نے بھیجا ہے کہ میں ایسے شخص کو وظیفہ دوں گا جو آپ کی خدمت میں درس سننے آیا ہو اور عربی دان نہ ہو۔ حضرت گنگوہی نے فرمایا اے بھائی تیرے صدق کی برکت کہ خدا تعالیٰ نے تیرا رزق بھیج دیا ہے۔ اس وقت حضرت خواجہ صاحب حضرت تھانوی کے بائیں طرف تشریف فرما تھے۔ خواجہ صاحب نے حضرت سے دریافت کیا کہ کوئی شخص ایسا اس وقت بھی ہو گا۔ حضرت تھانوی نے فرمایا کہ "ایک صاحب ابھی آئے ہیں وہ میری بائیں طرف بیٹھے ہیں" (یہ اشارہ حضرت خواجہ صاحب کی طرف تھا) (۱) ـــــ یہ خواجہ صاحب کا بخت تھا' اہل محبت کے لئے کس درجہ قابل رشک !!

ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحب اپنے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہایت والہانہ انداز میں باتیں کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ ہمارے حضرت ایسے ہیں۔ حضرت والا نے سن کر فرمایا "خواجہ صاحب میں نے عمر بھر آپ کو بنانے کی کوشش کی ہے اور آپ نے زندگی بھر (توصیف و مدح کر کے) بگاڑنے کی کوشش کی۔ آپ ہمیشہ یہ سمجھ کر گفتگو فرماتے ہیں کہ گویا آپ کے حضرت کے پاس نفس ہے ہی نہیں" (۲)

حضرت تھانوی قدس سرہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا۔ ہمراہیوں میں خواجہ صاحب بھی تھے اور ایک صاحب رئیس تھے تنوج کے جو بہت دیندار تھے۔ کھانا ساتھ تھا۔ جب کھانا شروع کیا تو اتفاق سے ایک بوٹی ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گئی۔ ان صاحب نے یہ کیا کہ اس کو جوتا سے

---

(۱) بروایت حاجی شیر محمد صاحب (مجاز بیعت حضرت حکیم امت مولانا تھانوی)

(۲) بروایت حضرت سید رزمی صاحب۔

تختے کے نیچے سرکا دیا۔ ان کی یہ حرکت مجھ کو بے حد ناگوار ہوئی۔ اب سوچا کہ اگر کچھ کہتا ہوں تو نیک آدمی اور رئیس پھر پڑھے بھی ان کو کیا کہوں مگر تنبیہ ضروری تھی یہ سمجھ میں آیا کہ ان کو عملی تبلیغ کرنی چاہیئے میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ یہ خدا کی نعمت ہے۔ اس کو اٹھا کر دھو کر دے دی جائے اور میں اس کو کھا لوں گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر کوئی اور کھائے تو اس کو اجازت ہے۔ میں نے کہا بشرطیکہ اس کی طبیعت کرے۔ خواجہ صاحب نے اس بوٹی کو دھو کر کھا لیا۔ اس واقعہ کو بیان کرنے کے بعد حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے فرمایا کہ "خواجہ صاحب بے حد بے نفس آدمی ہیں" (۱)

مولانا عزیز الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ خواجہ صاحب نے خود فرمایا کہ حضرت تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ مجھے دنیا سے اپنے جانے کا کوئی فکر و خیال نہیں جبکہ میرے بعد یہ دونوں موجود ہیں۔ احقر (خواجہ صاحب) نے عرض کیا کہ یہ دو کون ہیں فرمایا ایک تو مفتی صاحب (مفتی محمد حسن صاحب) ہیں اور دوسرے پر خاموش ہو گئے۔ غالباً دوسرے سے مراد خواجہ صاحب ہی ہیں۔ (۲)

حضرت خواجہ صاحب اکثر اپنے حضرت کی خدمت میں تشریف فرما ہوتے۔ ایک دفعہ حاجی شیر محمد صاحب کی موجودگی میں خانقاہ میں خواجہ صاحب تشریف لائے۔ ان کے ہمراہ کئی احباب ملازمین محکمہ تھے۔ حضرت کی خدمت میں ایک شخص نے عرض کیا کہ خواجہ صاحب تشریف لائے ہیں اور ان کے ہمراہ کئی اصحاب ہیں اور مجلس میں جگہ تنگ ہے۔ حضرت نے فرمایا آپ بے فکر رہیں۔ سب یہیں سما جائیں گے۔ خواجہ صاحب خواجہ صاحب نہیں رہے درویش ہو گئے ہیں اور وہ درویش پر گلیم بخند (۳) ایک دفعہ حضرت خواجہ صاحب نے حضرت تھانوی سے دعوت کے لئے عرض کیا کیونکہ حضرت خواجہ صاحب اپنے گھر والوں کے ہمراہ بمقام تھانہ بھون بہت دنوں تک قیام کرتے تھے۔ حضرت تھانوی نے فرمایا خواجہ صاحب میری دعوت بہت آسان ہے جو سالن گھر میں پکا ہو ایک برتن میں ڈال کر دو

---

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی۔ الافاضات الیومیہ حصہ سوم صفحہ ۱۰

(۲) عزیز الرحمٰن۔ القول العزیز۔ جلد اول (لاہور ۱۹۷۶ء۔ صفحہ ۹)

(۳) بہ روایت حاجی شیر محمد صاحب۔

روٹی اس پر رکھدیں اور گھر پر بھیج دیں بس میری دعوت ہوگئی ۔ (۱)

انتقال سے ایک روز پہلے حکیم سید ابراہیم صاحب رزمی خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ خواجہ صاحب نے اپنی صدری کی جیب سے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا والا نامہ نکالا اور ان کو پڑھ کر سنایا ۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا تھا کہ میں ایسا ناکارہ و آوارہ تھا ۔ حضرت کے فیض نظر نے کیا کر دیا ۔ اب آخرت کی فکر دامن گیر ہے ۔ میدان حشر میں دستگیری کا وعدہ فرمایا جائے اس پر حضرت تھانوی قدس سرہ نے تحریر فرمایا تھا ۔

" انشاء اللہ ثم انشاء اللہ حسب طلب ہی ہوگا " (۲)

طالب علمی کے زمانہ ہی میں حضرت سے بیعت ہو چکے تھے اور باطنی تربیت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا ۔ اس کا طبعی اثر یہ ہوا کہ ذکر و عبادت میں مشغول رہنے کا جذبہ بڑھا اور غالباً بی ۔ اے کے آخری سال میں تھے کہ تعلیم کی طرف سے طبیعت ہٹنے لگی تو گھر والوں کو فکر ہوئی کہ امتحان میں اگر ناکام ہو گئے تو بڑی مصیبت ہوگی ۔ حضرت کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا

" ایسے نہ بنو کہ دنیا تمہیں ناکارہ و بے عمل قرار دے ۔ تعلیم کے جس کام میں لگے ہو ۔ اس میں اوروں سے بھی آگے بڑھنے کی کوشش کرو ۔ اس دنیا میں ذرا کوتاہی نہ کرو ۔ تعلیم کے بعد اختیار ہوگا جو کام اختیار کرو ۔ " (۱)

تعلیم کے بعد ملازمت کی تلاش تھی ۔ انسپکٹر آب کاری کے نئے عہدے قائم ہوئے تھے ۔ حضرت نے ملازمت کی اجازت دے دی تھی لیکن آپ کے والد ماجد نے کہا کہ نوکری کا خیال چھوڑ دو ۔

---

(۱) بروایت حاجی شیر محمد صاحب ۔

(۲) بروایت حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب ۔

(۳) بروایت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

مگر چیر اسیوں میں اور ان میں سادگی اور لباس میں کوئی فرق معلوم نہ ہوتا۔ ان کو لوگ وضع قطع پر بہت ٹوکتے ہیں مگر یہ حالت کسی پر طاری ہو تب وہ جانے"

خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ عرض کیا کہ میرے پاس یادگارِ غالب رکھی ہے۔ اگر آپ کبھی کبھی دیکھیں تو آپ کے پاس رکھ دوں۔ فرمایا کہ یہاں مغلوبوں کا ہی کلام دیکھنے کی فرصت نہیں غالب کا کلام کہاں دیکھیں۔

فرنگی محل کے بعض علماء نے بہشتی زیور پر شدید نکتہ چینی کی اور حضرت کے خلاف بہت سخت کلمات کہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب میں حضرت کی کچھ عقیدت پیدا فرما دی تو حضرت خواجہ صاحب کے ذریعے تھانہ بھون حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ آپ نے اجازت تو دے دی مگر خواجہ صاحب سے فرمایا کہ یہ حضرات آئے ہیں تو ان کی تعظیم و تکریم اور خاطر تواضع مہمان داری وغیرہ تو اچھی طرح کروں گا مگر بات چیت ان سے زیادہ نہ کروں گا۔ اس واقعہ سے حضرت کے ہاں خواجہ صاحب کا جو مقام تھا وہ ظاہر ہے [۲]

فرمایا "خواجہ صاحب کو اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں کی نعمتیں دیں ان سے مجھے کتنی محبت ہے اور ان کو مجھ سے کتنی محبت ہے اس کو میں ہی جانتا ہوں مگر بعض دفعہ میں ان کو ڈانٹ بھی دیتا ہوں۔ ایک بار میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ خواجہ صاحب کبھی تو آپ پر واقعی خفا ہوتا ہوں اور کبھی اس وجہ سے بھی خفا ہوتا کہ لوگ آپ پر حسد نہ کریں [۳]

فرمایا کہ خواجہ صاحب کے دل میں واقعی یہی ہے کہ میرے (خواجہ صاحب) اندر کوئی لیاقت و قابلیت نہیں وہ اس قدر متواضع ہیں [۴]

---

[۱] ۔ مفتی محمد شفیع مجالس حکیم الامت ، (کراچی، ۱۹۷۴ء) ص ۲۳۲

[۲] مفتی محمد شفیع مجالس حکیم الامت ، (کراچی، ۱۹۷۴) ص ۲۲۴

[۳] ۔ القول الجلیل ، ماہنامہ العیانۃ ، جون ۱۹۹۱ء ص ۲۷

حضرت حکیم الامت
رحمۃ اللہ علیہ

حضرت خواجہ صاحب
کی
نظر میں

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رح

حضرت خواجہ صاحب کی نظر میں

حضرت تھانوی سے پہلی ملاقات

حضرت خواجہ صاحب کے گھر کا ماحول مذہبی تھا۔ اس لئے مذہبی کتابوں سے دل چسپی بچپن سے رہی۔ چونکہ آپ کے والد کا حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے تعلق ارادت تھا۔ اس لئے فطرتاً خواجہ صاحب کی کشش ان کے خلیفہ وقت حضرت مولانا تھانوی کی تصانیف کی طرف ہوئی پھر جو حضرت کا الہ آباد آنا ہوا تو قسمت نے تصنیفات سے صاحب تصانیف تک پہنچا دیا۔ ۱۳۲۶ھ کا واقعہ ہے کہ اتفاق سے مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ الہ آباد آئے ہوئے تھے۔ ان کے وعظ کا اشتہار ہوا جس کو دیکھ کر خواجہ صاحب بے تابانہ مسجد پہنچ گئے۔ (۱) یہ وہ زمانہ تھا جب خواجہ صاحب علی گڑھ کالج سے بی۔ اے کرنے کے بعد الہ آباد کالج میں قانون پڑھتے تھے اور محلہ کرٹھہ میں قیام فرما تھے۔

جب حضرت تھانویؒ کے وعظ کا اعلان ہوا۔ خود فرماتے ہیں "جلتی دھوپ میں دو ڈھائی میل کی مسافت طے کر کے پہنچا۔ حضرت اس وقت قیلولہ فرما رہے تھے۔ نماز ظہر کا وقت آیا۔ حضرت بیدار ہو کر قیام گاہ سے باہر نکلے۔ حضرت والا حسب عادت نیچی نگاہیں کئے مستانہ وار جھومتے ہوئے اس شان سے تشریف لا رہے تھے کہ چہرہ مبارک تو نہایت شاہانہ مگر لباس بالکل فقیرانہ بالکل سادہ کرتے اور کرتے کے اوپر کا بٹن کھلا ہوا کاندھے پر رومال آنکھیں سرگیں خمار آلود اور چونکہ سو کر تشریف لا رہے تھے۔ لہٰذا قدرے سرخی مائل اور بال بھی کسی قدر بکھرے ہوئے تھے بس کسی کا یہ شعر بالکل حسب حال تھا اور ہو بہو

---

(۱) سید سلیمان ندوی، یادِ رفتگاں (کراچی ۱۹۸۳)، ص ۳۰۴

صادق آرہا تھا ؎

قبا واکردہ و کاکل پریشاں کردہ می آید !!

بہ بیں ایں بے سروساماں چہ ساماں کردہ می آید (۱)

حضرت سے دل نے اس قدر انجذاب محسوس کیا اور طبیعت کو ایسی مناسبت محسوس ہوئی کہ اس اتفاقی زیارت کے بعد خواجہ صاحب نے حضرت سے بیعت کی درخواست کی اور عرض کیا حضرت ہمت نہیں ہوتی حالانکہ بیعت ہونے کو بہت جی چاہتا ہے کیونکہ اگر بیعت ہونے کے بعد بھی گناہ ہوتے رہے تو ایسی بیعت سے کیا فائدہ۔ اس لئے حضرت میرے ناپاک ہاتھوں کو اس قابل بنا دیں کہ حضور کے پاک ہاتھوں میں دے سکوں چنانچہ الہ آباد کے واپسی سفر میں بیعت فرمایا۔

بیعت کے بعد تھانہ بھون کی جو پہلی حاضری ہوئی اس کی روئداد خود خواجہ صاحبؒ کی زبانی سنیئے

"پہلی حاضری تھانہ بھون میں ایک اور عجیب بات بھی احقر پر طاری ہوئی۔ وہ یہ کہ حضرت والا جس قسم کی بھی گفتگو کسی سے فرماتے تھے یا جو بھی واقعہ فرماتے خواہ کسی کے متعلق ہی دینی یا دنیوی اس کو میں من وعن خود اپنے ہی کسی نہ کسی حال پر منطبق پاتا اور ساتھ ہی ساتھ اس کے ہر ہر جزو کی توجیہہ قریب اور وجہ انطباق بھی ذہن میں خود بخود بلا تکلف آتی چلی جاتی اور میں یہ سمجھتا کہ ان سب حکایات و تقریرات میں حضرت والا کو میرے لئے سراپا ہدایت ہی ہدایت بنا دیا تھا۔ مثلاً ایک بار حضرت والا تلاوت فرماتے ہوئے ریل کی پٹڑی پر صبح کی گشت کے لئے تشریف لے جارہے تھے اور احقر کو بھی نہایت عنایت سے خوشی کے ساتھ ہمراہ چلنے کی اجازت مرحمت فرمائی تھی۔ راستہ میں چند کالی بھجنگ بھینس ریلوے پٹڑی کو پار کرتی ہوئی ملیں۔ ان کو دیکھ کر حضرت والا نے احقر سے فرمایا کہ بھینس ایسی کریہہ صورت ہوتی ہے کہ اگر ان سے دودھ کی توقع نہ ہوتی تو ان کو کوئی بھی پالنا گوارا نہ کرتا" (۲)

حضرت تھانوی سے تعلق کے بعد آپ کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو گیا تھا۔

---

(۱) اشرف السوانح ۔ ص ۳۴۴

(۲) اشرف السوانح (حصہ دوم) لاہور۔ ص ۱۴۰

ڈپٹی کلکٹر آپ بن تو گئے مگر اس عہدہ سے آپ مطمئن نہ تھے کیونکہ کئی باتیں خلاف ضمیر کرنی پڑتی تھیں، منصب وجاہ کا خیال تو ذہن کے کسی گوشہ میں تھا ہی نہیں، فکر اس کی تھی کہ ذریعہ معاش ایسا مل جائے کہ کوئی کام خلاف شرع اور ضمیر نہ کرنا پڑے۔ اس نقطۂ نظر سے آپ کی یہ کوشش رہی کہ محکمہ تعلیم میں جگہ مل جائے۔ خواہ تنخواہ کا اس میں نقصان کیوں نہ ہو۔ حضرت کے ملفوظات میں ہے، کہ خواجہ صاحب نے یہ قدم محض اپنے دین کی حفاظت کے لئے اٹھایا۔ اور اس بات کے لئے بھی راضی ہو گئے کہ موجودہ تنخواہ سے کم پر محکمہ تعلیم میں جانے کو تیار ہوں لیکن جواب ملا کہ تمہارے لائق کوئی عہدہ محکمہ تعلیم میں خالی نہیں ہے۔"

خواجہ صاحب اس اطلاع سے مایوس ہو گئے۔ خواجہ صاحب کانپور میں جب تھے تو حضرت تھانوی" وہاں تشریف لائے۔ خواجہ صاحب نے محکمہ تعلیم میں ملازمت ملنے سے مایوسی کا حال عرض کیا تو فرمایا کہ "ابھی آپ مایوس نہ ہوں کوشش برابر جاری رکھیں۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ آپ کے لئے کوئی غیب سے بہتر صورت نکل آئے گی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مجاز صحبت حضرت مولانا منظور احمد صاحب تحریر فرماتے ہیں "خواجہ صاحب کی اولیں ملازمت کا گریڈ ۲۵۰۔ ۲۵۔ ۵۰۰۔ ابتدائی سکیل میں تھا۔ خواجہ صاحب کو شروع میں سود کے مقدمے طے کرنے کے لئے دیئے گئے مگر خواجہ صاحب نے کبھی سود کی ڈگری نہیں دی ہمیشہ اصل کی ہی دی۔ چونکہ ایسا فیصلہ سرکاری قانون کے مطابق نہ تھا اس لئے مقدمات نظر ثانی یا اپیل کی ہی زد میں آتے تھے۔ ان کی بدنامی کا بھی خطرہ تھا۔ حضرت تھانوی سے عرض کی کہ کیا کروں؟ اگر سرکاری قانون پر چلوں تو اللہ تعالیٰ ناراض اور شرعی قانون پر چلوں تو حکومت ناراض۔ حضرت نے مشورہ دیا کہ اپنی خدمات کسی دوسرے محکمہ میں منتقل کروا لو۔ ڈی۔ پی۔ آئی الہ آباد نے کلکٹر سے خواجہ صاحب کے متعلق پوچھا کہ ان کا کام کیسا ہے اور وہ کیسے ہیں؟ جواب دیا گیا کہ نہایت ایماندار وجفاکش ہیں مگر مذہبی مالیخولیا میں مبتلا ہیں۔ حضرت قدس سرہ نے فرمایا کہ آپ کے مذہبی ہونے کی کافر نے بھی تعریف کی۔" ڈی۔ پی۔ آئی الہ آباد نے کہا کہ ہم ان کو ۲۵۰ روپے کی تنخواہ جو بطور ڈپٹی کلکٹر دے رہے ہیں اپنے محکمہ میں نہیں دے سکتے۔ نہ ہمارے ہاں فی الحال کوئی جگہ اس گریڈ کے افسر کی خالی ہے۔ فی الحال ہم آپ کو

ڈپٹی انسپکٹر مدارس کی ملازمت دے سکتے ہیں اور ابتدائی سکیل کی تنخواہ ایک سو پچاس روپیہ ماہوار ملے گی۔ خواجہ صاحب نے اپنی رضامندی لکھ کر حکومت کو دے دی۔ ڈپٹی انسپکٹری ملنے پر ان کے ایک دوست جو خود ڈپٹی کلکٹر (اے۔ڈی۔ایم) تھے خواجہ صاحب کو طعنہ دینے لگے انسان تو ترقی کی سوچتا ہے اور آپ نے تنزل کیا؟ تین سو پچاس روپے کی ملازمت چھوڑ کر ایک سو پچاس روپے کی ملازمت لے لی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا ؎

کہنے کا ہم نشیں مانا میں بُرا نہیں
صاحب نظر کے سامنے ہائے ابھی پڑا نہیں

مطلب یہ تھا کہ اے ڈپٹی کلکٹر صاحب آپ ابھی حضرت تھانوی کے سامنے نہیں آئے ورنہ اس مجلس میں بیٹھ کر آپ کی حالت بھی میری ہی جیسی ہوتی۔" (۱)

حضرت قدس سرہ سے تعلق کے بعد خواجہ صاحب نے اپنے آپ کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے لئے وقف کر دیا تھا۔

حضرت تھانوی سے تعلق کے بعد آپ کی زندگی میں ایک انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ نے اپنے چار لڑکوں کو انگریزی کی تعلیم سے دور رکھا۔ اس پر خواجہ صاحب کے خاندان کے دنیادار لوگ کہتے تھے کہ قیامت میں حضرت تھانوی سے باز پرس ہو گی کہ انہوں نے خواجہ صاحب کا خاندان برباد کر دیا۔ (۲)

آپ کثیر اخراجات برداشت کر کے چند گھنٹوں کے قیام کی مہلت ملنے پر بھی دور دراز علاقوں سے حاضر ہوتے تھے۔ نیز لمبی لمبی رخصتیں نصف تنخواہ اور بلا تنخواہ کی لے کر مہینوں بلکہ بعض مرتبہ برسوں حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔

حضرت حکیم الامت کے خلیفہ مجاز حضرت شبیر محمد صاحب تحریر فرماتے ہیں "ایک مرتبہ میں اور

---

(۱) بہ روایت مولانا منظور احمد صاحب مجاز صحبت حکیم الامت [حال مقیم ڈومیلی جہلم]

(۲) بہ روایت حضرت حاجی شبیر محمد صاحب مجاز بیعت حضرت حکیم الامت۔

خواجہ صاحب ریل میں سہارن پور سے تھانہ بھون کی طرف سفر کر رہے تھے۔ راستہ میں فرمایا کہ میں دَورہ پر جاتا ریل کا ٹائم ٹیبل دیکھ کر اندازہ لگاتا کہ تھانہ بھون حضرت کی خدمت میں ایک گھنٹہ حاضری نصیب ہو گی اور واپس ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہوگا۔ میں نے پچیس پچیس روپیہ ریل کا کرایہ صرف ایک گھنٹہ خدمتِ اقدس میں بیٹھنے کے لئے صرف کر دیا۔(۱)

خواجہ صاحب کو اپنے شیخ کے ساتھ اس قدر والہانہ تعلق تھا کہ فرماتے تھے کہ میرا جی چاہتا تھا کہ بغل میں کتابیں دبا کر ہر کس و ناکس اہل و نااہل بلکہ در و دیوار شجر و حجر سب سے دیوانہ وار حضرت والا کا تذکرہ کروں۔ ایک بار عید الضحیٰ کے موقع پر قربانی کا بکرا بندھا ہوا تھا فرماتے ہیں کہ "جی چاہا کہ اس کے پاس بیٹھ کر حضرت والا کا تذکرہ کروں" (۲)

حضرت تھانوی اور حضرت خواجہ صاحب کے تعلق قوی کے متعلق حضرت کے ایک مجاز صحبت حضرت بابا نجم احسن صاحب دامت برکاتہم تحریر فرماتے ہیں "حضرت خواجہ صاحب کا ایک مطلع ہے

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی لو شمع محفل کی !
پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

عموماً اپنے حسبِ حال اور موقع پر یہ کیفیت قلبی اور تصویر کشی اور جگہ بھی صادق آسکتی ہے مگر خواجہ صاحب کے یہاں اس کیفیت اس تاثیر اور محویت کے لئے ایک ہی ہستی موثر ہو سکتی تھی جس سے ان کے تعلق خاطر کی کوئی تھاہ نہ تھی۔

خواجہ صاحب اپنا ایک واقعہ بیان کرتے تھے کہ اس ملازمت سے جس میں اللہ تعالیٰ نے مال و جاہ دونوں سے نوازا تھا۔ مدت پوری ہونے سے پہلے ہی سبکدوش ہونے کے خواہش مند تھے۔ دنیا کے بکھیڑوں میں ان کا جی نہ لگتا تھا اور محبوب اور یادِ محبوب کے اور اپنے درمیان یہ حجاب مصروفیت ان کی طبع لطیف پر نہایت گراں گزر رہا تھا۔ یادِ حق میں بلاواسطہ اور بواسطہ قربِ شیخ میں زیادہ وقت لگانا

---

(۱) یہ روایت حضرت حاجی شیر محمد صاحب

(۲) اشرف السوانح جلد دوم صہ ۵۰

چاہتے تھے اور شیخ سے دوری ان کے لئے اضطراب قلب کا سبب ہو رہی تھی۔ ان کے اس خیال سے لوگ باخبر ہو گئے تھے۔ ان کے برادر زادہ جو ان کے داماد بھی تھے اور بہت ہی فہیم و سلیم تھے۔ ان کو ایک طویل خط لکھا اور ان کے حالات اور متعلقین کے متعلق ان کی ذمہ داریوں کی طرف بہت ہی سعادت مندانہ طریقے پر توجہ دلائی اور اس ارادہ سے باز رہنے کی صلاح دی۔ فرماتے تھے کہ میں نے خط پڑھنے کے بعد انہیں بس یہ لکھ دیا۔

یہ سب سوچ کر دل لگایا ہے ناصح
نئی بات کیا آپ فرما رہے ہیں (۱)

حضرت تھانوی کے ایک اور خلیفہ ارشد حضرت مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ صاحب کے عشق کے متعلق ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں کہ ایک بار ہمارے مرشد حضرت تھانویؒ نے حضرت خواجہ صاحب پر عتاب فرمایا اور حکم فرمایا کہ مجلس میں شرکت کی اجازت نہیں ہے۔ حضرت خواجہ صاحب بڑے عاشق زار تھے۔ ایک شعر میں اپنی محبت کا اظہار فرمایا۔

ادھر وہ در نہ کھولیں گے اِدھر میں در نہ چھوڑوں گا
حکومت اپنی اپنی ہے کہیں ان کی کہیں میری (۲)

حضرت تھانوی کے ایک مجاز صحبت ماسٹر منظور احمد صاحب فرماتے ہیں۔

" سنا ہے کہ پہلی بار جب حضرت خواجہ صاحب خانقاہ میں حاضر ہوئے تو نیم شب کے بعد دو بجے سے تمام خانقاہ والوں کو بیدار پایا۔ کوئی نماز پڑھ رہا ہے۔ کوئی تلاوت میں مشغول ہے۔ کوئی ذکر میں محو ہے۔ کوئی استغفار کر کے رو رہا ہے تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے متاثر ہو کر حضرت اقدس مولانا تھانویؒ قدس سرہ العزیز کے قلب کی تعریف میں مندرجہ ذیل شعر کہا۔

جس قلب کی گرمی نے دل پھونک دیئے لاکھوں
اس قلب میں یا اللہ کیا آگ بھری ہو گی "

---

(۱) مکتوب گرامی حضرت بابا نجم احسن صاحب مجاز صحبت حضرت حکیم الامت تھانوی
(۲) عبدالغنی پھولپوری معرفت الہیہ (کراچی، ۱۳۹۱ھ) ص ۲۶۰

ایک مرتبہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اقدس کی خدمت میں لکھا کہ حضرت آپ کے والا نامے نے میرے اندر غیر معمولی دینی کیفیت پیدا کر دی اور یہ شعر لکھا ؎

ساقی تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تجھ نے یہ مئے خام شیشے میں بھری ہوگی (۱)

حضرت خواجہ صاحب اپنے شیخ کی خدمت میں اکثر حاضر رہا کرتے تھے ایک مرتبہ بہت دن کے بعد حاضری کا اتفاق ہوا۔ اس موقع پر آپ نے بہت سے اشعار لکھے۔ ان کے دو شعر بطور مشتے نمونہ از خروارے ملاحظہ ہوں ؎

نہیں جانا ہوا ہے جانب میخانہ برسوں سے
بھرا ہے دل میں شوق نعرہ مستانہ برسوں سے
کبھی کعبہ تھا دل اب تو ہے یہ بتخانہ برسوں سے
ترستا ہوں تجھے اے جلوہ جانانہ برسوں سے

ایک مرتبہ حضرت مولانا شبیر علی صاحبؒ کے مکان پر کسی اہم مشورہ کے لئے مجلس شوریٰ منعقد تھی جس میں حضرت تھانویؒ بھی تشریف فرما تھے۔ اختتام مجلس پر حضرت والا تشریف لے گئے لیکن حاضرین پر ایسی بے خودی طاری تھی کہ آپ کے جانے کے بعد بھی ہر شخص حیران اور مبہوت تھا۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے اس موقعہ پر فی البدیہہ شعر پڑھا ؎

وہ اٹھ بھی گئے بزم سے کب کے مگر اب تک
اللہ ری حیرت جو جہاں تھا وہ وہیں ہے (۲)

خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں "ایک مرتبہ حضرت والا کی خدمت بابرکت میں ایک ماہ قیام کر کے رخصت ہوا تو قلب میں نہایت کیف لے کر رخصت ہوا جس سے متاثر ہو کر راستے ہی میں بے اختیار

---

(۱) بہ روایت حضرت مولانا ماسٹر منظور احمد صاحب

(۲) بہ روایت حکیم انوار الحق تھانوی صاحب۔

کچھ اشعار بھی ہو گئے، چند یہ ہیں ؎

مجھ پہ یہ لطف فراواں! میں تو اس قابل نہ تھا
تری اس رحمت کے قرباں! میں تو اس قابل نہ تھا
یہ تہی دستِ ازل بھی تیرے در سے اے کریم
لے چلا ہے بھر کے داماں، میں تو اس قابل نہ تھا
ہے احد معبود اپنا اور نبی خیر الوریٰ
شیخ بھی ہے قطبِ دوراں، میں تو اس قابل نہ تھا

حضرت خواجہ صاحب کے لطافتِ احساس کا یہ اثر تھا کہ فرماتے تھے "مجھے تھانہ بھون کی ہوا میں خوشبو محسوس ہوتی ہے۔" (۱)

حضرت خواجہ صاحب نے اپنے شیخ کے احسانات کا ذکر ایک طویل نظم میں کیا ہے جس کے دو چار اشعار یہ ہیں ؎

چسکا لگا کے یادِ خدا کا حضور نے — بیزار کاروبار و مشاغل بنا دیا
دلدادہ کر دیا مجھے خلوت کا آپ نے — اس بزمِ بے ثبات سے بددل بنا دیا
دینی امور میں تو کیا مجھ کو مستعد! — اور دنیوی امور میں کاہل بنا دیا
مشکل تھا دین، سہل تھی دنیا اب آپ نے — مشکل کو سہل، سہل کو مشکل بنا دیا

حضرت خواجہ صاحبؒ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں "ایک بار حضرت والا بہ عزمِ سفر ریلوے سٹیشن تھانہ بھون پر ریل کے انتظار میں تشریف فرما تھے۔ احقر بھی ساتھ تھا چونکہ حضرت والا حسبِ معمول احتیاطاً ریل کے وقت سے پہلے اسٹیشن پہنچ گئے تھے اس لئے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا چونکہ حسبِ عادت بہت سے حضرات حضرت والا کو رخصت کرنے اسٹیشن تک آئے تھے۔ اس لئے حضرت والا سب کو اپنے ملفوظات سے مستفید فرما رہے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب کا تذکرہ فرمایا جو فاری تھے اور حضرت والا

---

(۱) عبدالماجد دریاآبادی ۔ حکیم الامت ۔ لاہور ۔ ۱۹۵۶ء ص ۹۵

کے مدرسہ میں مدرس تھے وہ اکثر لٹھ کندھے پر رکھے ہوئے ایک پائنچہ پنڈلیوں تک چڑھائے مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے۔ میں نے جو انہیں ایک بار اس حال میں دیکھا تو کہا قاری صاحب ذرا یہ مصرعہ بھی گنگناتے جایئے ؎

ان دنوں جوش جنوں ہے میرے دیوانے کو

یہ مصرعہ حضرت نے اس وقت پڑھا۔ اس وقت حضرت نے نہ معلوم کس کیفیت سے متاثر ہوکر یہ مصرعہ پڑھا تھا کہ سنتے ہی بس میرے اندر بھی ایک جوشِ جنوں کی سی کیفیت ہوگئی۔ مجھے اس وقت پانی کی ضرورت تھی۔ پانی لینے کے واسطے لوٹا ہاتھ میں لئے چلا جا رہا تھا اور اسی مصرعہ کو نہایت کیف کے ساتھ مزے لے لے کر گنگناتا جاتا تھا۔ واپسی تک یہی فقرہ وردِ زبان رہا۔

پھر جب حضرت والا سے آنکھیں چار ہوئیں تو حالت کا ایسا غلبہ ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں قابو سے باہر ہونے لگے اور میں گرنے کے قریب ہوگیا۔ اس وقت مجھ کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی کہ اگر میں اس وقت مجمع عام کے سامنے گر گیا تو بڑی ہنسائی ہوگی۔ لہٰذا خاص اہتمام کے ساتھ بمشکل اپنے آپ کو سنبھالے رہا یہاں تک ریل آگئی اور حضرت والا مع رفقاء کے ایک ڈبہ میں بیٹھ گئے۔ جناب حافظ عبد اللطیف صاحب مہتمم مدرسہ مظاہر العلوم اور حافظ عبد المجید تھانوی صاحب بھی رفیق سفر تھے احقر مہتمم صاحب سے ملا ہوا بیٹھا تھا۔ ریل میں بیٹھ کر بھی اسی حالت کا بدستور غلبہ تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بیٹھا ہوا بے قابو ہو رہا تھا۔ اور مہتمم صاحب کی طرف جھک جھک پڑتا تھا اور ان کے اوپر گر گر پڑتا تھا اور ڈر ڈر کر اپنے دل میں بلکہ چپکے چپکے زبان سے بھی کہہ رہا تھا کہ اگر یہ حالت بڑھی تو لوگ کیا کہیں گے۔ جب یہ حالت کسی طرح فرو نہ ہوئی تو اپنی جیب سے ایک مستعمل لفافہ نکال کر صاف جگہ پہ ایک شعر لکھ کر حضرت والا کی خدمت میں پیش کر دیا۔

دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدا را

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

کیونکہ یہ شعر احقر کے بالکل حسب حال تھا۔ حضرت والا نے اس پرچہ کو پڑھ کر عجیب انداز کے ساتھ

فرمایا کہ کیا میں اس کو تعویز بناکر اپنے پاس رکھ لوں۔ اس پر لطف ارشاد سے اس کیفیت میں بجائے سکون کے اور ترقی ہوگئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد حافظ عبدالمجید صاحب سے فرمایا کہ اچھا حافظ جی ذرا پنسل تو دیجئے خواجہ صاحب کو اس پرچہ کا جواب ہی لکھ دوں پھر یہ شعر میرے شعر کے نیچے تحریر فرمایا ۔

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں

ما نمی خواہیم ننگ و نام را

اور پھر میرا پرچہ مجھ کو واپس کر دیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہنسائی اور بدنامی کا تو میں اندیشہ کر رہا تھا اور اسی کے متعلق حضرت والا نے یہ شعر تحریر فرمایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت والا کو میری اس کل حالت کا اچھی طرح احساس اور انکشاف ہوگیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد حضرت کی توجہات کی برکت سے اور احقر کی جانب بار بار نظر فرمانے کے اثر سے مجھ کو الحمدللہ سکون ہوگیا۔ بمصداق قول احقر ۔

جادو یہ کیا اسے یار کر دیا

مجذوب سے بھی مست کو ہشیار کر دیا (۱)

ڈاکٹر منظور احمد وجی صاحب شیخ و مرید کے تعلقات کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں۔

" حضرت مجذوب کو اپنے مرشد برحق سے والہانہ شیفتگی تھی اور انہیں فنافی الشیخ کا درجہ حاصل تھا۔ شیخ کی بارگاہ میں ان کو بڑی مقبولیت اور محبوبیت حاصل تھی جس کے اشارے کہیں کہیں ان کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں مثلاً ۔

مجذوب کو تو لائے وہ ہمراہ بزم میں

اور سالکوں کو دور سے رستے بتا دیئے

حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کے ربط و تعلق کے جو واقعات سننے اور پڑھنے میں آتے ہیں اس کی زندہ مثال حضرت مجذوب اور ان کے مرشد کے تعلق میں نظر آتی ہے۔ حضرت مجذوب شیخ کی شراب عشق میں سراپا مخمور تھے اور ان کا ہر موئے بدن شیخ کی ثنا و صفت کا ایک شعر تھا جس پر ان کا کلام

---

(۱) اشرف السوانح جلد دوم ص ۱۵۹ تا ۱۶۱

شاہد ہے ؎

تیرے محبوب کی یارب شباہت لے کے آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کر دے میں صورت لے کے آیا ہوں!

جو اشرف تھا زمانے میں جو اشرف ہے زمانے میں!
میں ایسے تیرے اشرف کی عقیدت لے کے آیا ہوں

خم کوثر موجزن پیر مغاں کے دل میں ہے
کس میں ہے وہ بات جو اس مرشد کامل میں ہے

تھانہ بھون میں ایک مرتبہ ملیریا کی شدت ہوئی۔ خواجہ صاحب بھی بیمار پڑے۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دودھ کے سوا کوئی غذا نہ کھایئے کہ غذا کی بے احتیاطی سے بخار بگڑ کر موسمی ہو جاتا ہے۔ انہوں نے درخواست منظور کر لی۔ بخار کچھ کم ہوا تو گھر جانے کا ارادہ کیا۔ صبح کے وقت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خلاف معمول خانقاہ میں تشریف لائے۔ اپنے لئے کھچڑی تیار کرائی تھی وہ آئی۔ جب خواجہ صاحب رخصت ہونے لگے اور واپس آئے تو حضرت سید صاحب نے پوچھا کہ کچھ کھایا تو نہیں؟ فرمایا میں نے حضرت کے ساتھ کھچڑی کھالی۔ وہ انشاء اللہ مضر نہ ہوگی۔ ایسی برکت کی چیزیں کہاں ملتی ہیں۔ عین رخصت کے وقت حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دیکھا کہ خواجہ صاحب بچوں کی طرح دو زانو ہو کر حضرت کے زانو پر سر رکھ کر کہہ رہے تھے کہ حضرت میرے حسن خاتمہ کی دعا فرمائیں اور حضرت تسلی فرماتے جا رہے تھے۔ (۱)

مولوی ڈاکٹر منظور احمد صاحب موجی شیخ و مرشد کے باہمی تعلقات کے متعلق ایک اور واقعہ بیان فرماتے ہیں "حضرت خواجہ صاحب جب بہ سلسلۂ دورہ سیتاپور تشریف لائے۔ کچھ عرصہ دراز سے تھانہ بھون حاضری کا موقع نہیں ملا تھا۔ کیفیت طاری تھی۔ چند اشعار کی آمد شروع ہوگئی۔ اور ایک نظم بن گئی۔ حکیم کرم حسن صاحب سیتاپوری کے مکان پر حکیم صاحب موصوف مرحوم احقر اور چند دیگر شعراء اور

---

(۱) سید سلیمان ندوی: "یادِ رفتگاں" (کراچی، ۱۹۸۳ء) ص ۳۰۸

مخصوصین موجود تھے۔

اس نظم کا مطلع یہ ہے ؎

نہیں جانا ہوا جانب میخانہ برسوں سے

بھرا ہے دل میں شوق نعرۂ مستانہ برسوں سے

اس نظم کے ابتدائی اشعار خواجہ صاحب سنانے پائے تھے کہ چیخیں مار مار رونے لگے بیٹھے ہوئے لیٹ گئے اور ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ سامعین متاثر ہو گئے اور ان پر سکتہ کا عالم طاری ہو گیا۔ کافی دیر بعد قدرے افاقہ ہوا پھر آنسوؤں کے ساتھ اشعار کا سیل رواں ہوا۔ ۵۰۔ ۶۰ اشعار اسی دن لکھ کر تھانہ بھون حضرت اقدس تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں روانہ کر دیئے گئے۔ (۱)

حضرت علمائے فرنگی محل لکھنؤ حضرت خواجہ صاحب کے کلام کے عاشق و دلدادہ تھے۔ اکثر شب میں حضرت مجذوب صاحب اپنے حالات برابر حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لکھ لکھ کر روانہ فرماتے تھے اور جو احکامات صادر ہوتے رہتے تھے ان پر سختی سے عمل فرماتے رہتے تھے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی نے ۲۰ یوم کے لئے سکوت کا حکم دیا۔ جب علمائے فرنگی محل کو اطلاع ملی بے چینی پھیل گئی۔ علماء حضرات نے متفقہ طور پر ایک عریضہ حضرت اقدس تھانوی کی خدمت میں اس مضمون کا روانہ فرمایا کہ حضرت خواجہ صاحب کی شاعری ہم سب کے لئے غذائے روح ہے یہاں صرف سامعین مخصوصین کی نشست ہوتی ہے اس لئے درخواست کی جاتی ہے کہ یہاں کی نشست کو مستثنیٰ فرمایا جاوے بڑا کرم ہوگا۔ حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ارقام فرمایا کہ میرا اور خواجہ صاحب کا تعلق مریض اور طبیب کا سا ہے اگرچہ مجھ میں طبیب بننے کی اہلیت نہیں لیکن اگر کسی نے طبیب بنا ہی لیا ہے تو یہ طبیب کا فرض ہے کہ وہ جن چیزوں کو مفید سمجھے استعمال کرائے اور جن کو مضر سمجھے ان سے پرہیز کرائے خواجہ صاحب کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر چاہیں تو کسی دوسرے طبیب سے رجوع کریں۔ آپ حضرات کی خاطر ایک صورت ذہن میں یہ ہے کہ اکثر اطباء اپنی موجودگی میں بعض دفعہ کچھ بدپرہیزی کی اجازت دے

---

(۱) بروایت مکرمی ڈاکٹر مولوی منظور احمد صاحب مرحوم

دیتے ہیں اور نسخہ میں کچھ رعایت کر دیتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ میں آپ حضرات کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں اور اپنی موجودگی میں خواجہ صاحب کو اجازت دے دوں۔ دوسری یہ کہ آپ حضرات مع خواجہ صاحب کے یہاں تشریف لے آئیں اور میں خواجہ صاحب کو اجازت دے دوں۔ پہلی صورت اس لئے دشوار ہے کہ میری طبیعت ناساز ہے۔ اب صرف دوسری صورت ہی قابل عمل ہے آپ حضرات اگر یہاں تشریف لے آویں تو میری عزت افزائی ہوگی اور میں اپنی موجودگی میں خواجہ صاحب کو اجازت دے دوں گا۔ جب یہ جواب لکھنو پہنچا اور خواجہ صاحب نے بھی اسے پڑھا تو بس پڑھتے ہی چیخیں نکل گئیں۔ غش کھا کر گر پڑے، بہت دیر بعد جب ہوش بجا ہوئے تو روتے روتے فرماتے تھے کہ حضرت نے یہ کیسے لکھ دیا کہ دوسرے طبیب سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔" (۱)

یہ تھا عشق کا عالم۔

اورئی میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شاندار مکان تعمیر کروایا تھا جب حضرت تھانوی نے وہ مکان دیکھا تو فرمایا کہ یہ مجذوب کا مکان تو معلوم نہیں ہوتا۔ شیخ کے اس ارشاد کا حضرت خواجہ صاحب پر اس قدر اثر ہوا کہ مکان کے باہر ایک معمولی کمرہ تیار کروا کے اپنی سکونت زندگی بھر اسی کمرہ میں رکھی۔ اس واقعہ سے جہاں شیخ کی سادگی کا علم ہوتا ہے وہاں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمال اتباع شیخ بھی حیرت انگیز ہے۔ (۲)

حضرت تھانوی کی وفات کے بعد حضرت خواجہ صاحب کی حالت بہت ہی ناقابل بیان ہو گئی تھی آپ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

پھرتا ہوں دل میں یار کو مہماں کئے ہوئے
روئے زمین کو کوچہ جاناں کئے ہوئے
میں بے قرار کس کو خبر ہے کہ قلب میں
ساماں صد قرار ہوں پنہاں کئے ہوئے

---

(۱) بروایت ڈاکٹر مولوی منظور احمد صاحب موجی (۲) بروایت حکیم سید ابراہیم صاحب رزمی

حضرت خواجہ صاحب کی اسی حالت کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں " وفات کے بعد جب پہلی مرتبہ خواجہ صاحب تھانہ بھون حاضر ہوئے اور حسب سابق خانقاہ کے حجرہ میں مقیم ہو گئے۔ میں بھی خبر پاکر تھانہ بھون پہنچا اور ایک عجیب انداز میں ان کے ساتھ ملاقات کی نوبت آئی۔ خواجہ صاحب کا ہمیشہ یہ معمول تھا کہ جب میں تھانہ بھون حاضر ہوتا اور خواجہ صاحب کو میرے آنے کی خبر ملتی تو خانقاہ کے دروازے پر تشریف لاتے اور وہیں ملاقات ہوتی تھی مگر اس مرتبہ خواجہ صاحب خلاف عادت یہاں تک نہیں آئے۔ میں خود ان کے کمرہ میں پہنچا تو دیکھا کہ خواجہ صاحب کمرہ کی چوکھٹ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے کھڑے جھوم رہے ہیں اور یہ شعر پڑھ رہے ہیں۔"

چمن کا رنگ گو تو نے سراسر اے خزاں بدلا
نہ ہم نے شاخ گل چھوڑی نہ ہم نے آشیاں بدلا

اس واقعہ کے بعد مفتی صاحب تحریر فرماتے ہیں " اب معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب کو شاخ گل سے چمٹے رہنے کا یہ سماں ہی دکھانا مقصود تھا۔ اس کا جو اثر مجھ پر اور سب دیکھنے والوں پر ہوا وہ تحریر دبیان میں آنے والی چیز نہیں۔" (۱)

جب حضرت تھانوی کا انتقال ہوا تو آپ نے حضرت کی پیشانی کو بوسہ دے کر فرمایا "واہ رے شیخ ایک سی زندگی گذار دی۔ (۲)

مولانا محمد عرفان صاحب جو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آخری سفر امرتسر تا اردوئی ساتھ تھے بیان فرماتے ہیں کہ "جن حضرات نے خواجہ صاحب کو ان کے آخری ایام میں دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ خواجہ صاحب آخر عمر میں فنافی الشیخ کے منتہا کو پہنچ گئے تھے۔ جب بات کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت حکیم الامت بات کر رہے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب کی داڑھی اور شکل بالکل حضرت تھانوی کی طرح ہو گئی تھی۔

---

(۱) بہ روایت حضرت مفتی محمد شفیع صاحب

(۲) مولانا محمد اشرف، سلوک سلیمانی [لاہور۔ ۱۹۶۹) صـ ۱۰۸

حضرت حکیم الامت کے وصال کے بعد یہ فقرہ اللہ میرے حضرت کے درجات کو بلند کرے ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ کوئی بھی بات کرتے ہوئے درمیان میں یہ فقرہ ضرور استعمال کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ہندو وکیل سے کسی مقدمہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے لیکن درمیان میں یہ بار بار کہہ رہے تھے "اللہ میرے حضرت کے درجات کو بلند کرے" "اللہ میرے حضرت کے درجات کو بلند کرے"[1]

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد اکثر افسردہ رہتے تھے۔ ایک دفعہ گرمی کے موسم میں اورئی ڈیرہ تشریف راں تشریف لے جا رہے تھے حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب اسٹیشن پر موجود تھے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ حضرت اس گرمی میں سفر کیوں فرما رہے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے خواب میں یہ شعر پڑھا ؎

کونہ کونہ ڈھونڈتا پھرتا ہوں رونے کے لئے
جھانکتا پھرتا ہوں قبریں سونے کے لئے

چنانچہ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد خواجہ صاحبؒ کا انتقال ہو گیا۔ (۲)

ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ للت پور کے مکان میں مقیم تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد حضرت ثامن علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت حکیم الامتؒ) کے مکان پر کھانے کو بیٹھے تو حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کھانے کے دوران اشعار سنانے شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ اس انہماک اور ذوق و شوق سے آگے بڑھا کہ رات کے تین بج گئے۔ حکیم سید ابراہیم صاحب رزمی نے بھی اس مجلس میں حصہ لیا اور جب ایک موقعہ پر یہ شعر پڑھا ؏

سر بالیں پہ آئے کیوں نہیں یہ افسردگی کیا ہے
مجھے کھو کر بہت پچھتائے گا ظالم ابھی کیا ہے

تو حضرت خواجہ صاحب پر کیفیت گریہ طاری ہو گئی اور حضرت خواجہ صاحب نے فرمایا کہ "مجھے اپنے

---

(۱) بہ روایت مولانا عرفان احمد صاحب۔

(۲) بہ روایت حضرت حکیم سید ابراہیم صاحب رزمی۔

شیخ یاد آ گئے"۔ (۱)

حضرت خواجہ صاحب اپنے شیخ کے انتقال کے بعد اکثر یہ اشعار پڑھتے رہتے تھے ؎

بس ایک بجلی سی پہلے کوندی پھر اس کے آگے خبر نہیں ہے
اور اب جو پہلو کو دیکھتا ہوں تو دل نہیں ہے جگر نہیں ہے
کچھ اور ہی اب ہے میری دنیا جو کوئی پیش نظر نہیں ہے
وہ حال قلب و جگر نہیں ہے وہ رنگ شام و سحر نہیں ہے
قرار سے جس پہ جم کے بیٹھوں کوئی بس اب ایسا در نہیں ہے
وہ آستاں ہائے جب سے چھوٹا کوئی میرا مستقر نہیں ہے
ہنسی بھی ہے میرے لب پہ ہر دم اور آنکھ بھی میری تر نہیں ہے
مگر جو دل رو رہا ہے پیہم کسی کو اس کی خبر نہیں ہے
تھکا مسافر ہے شام سر پر نہ کوئی ساتھی نہ کوئی رہبر
پھر ایسی منزل کہ اس سے بڑھ کر کوئی سفر پر خطر نہیں ہے
نہ ہوش اپنا نہ ہمنشیں کا نہ جان زار و دل حزیں کا
خیال ہر دم ہے اک حسیں کا بس اب کسی کی خبر نہیں ہے
فنا اسے کر سکے بھلا یہ اجل کی دسترس کہاں ہے
وہ غیر منفک جو اک ربط خفی میرے ان کے درمیاں ہے
کہاں یہ خوش رنگ تیلیاں اور کہاں وہ بدرنگ خشک تنکے
مگر قفس پھر بھی اف قفس ہے اور آشیاں پھر بھی آشیاں ہے

اس سہ دری اشرف فردوس مکاں میں

---

(۱) بہ روایت حضرت مولانا سید ابراہیم صاحب رزمی۔

جب آئے زیارت کو تو باچشم تر آئے
جو بزم بھری رہتی تھی مردانِ خدا سے
خالی وہ نظر آئے تو کیوں جی نہ بھر آئے

ڈھونڈتا ہے دل وہی کیف آفریں ماحول پھر
وہ بہاریں ہیں کہاں جو آہ میخانے میں تھیں
مستیاں ہر سو برستی ہیں در و دیوار سے
اور وہ کیفیتیں جو خم کے پیمانے میں تھیں

حضرت قدس سرہ کے انتقال کے بعد ایک مرتبہ تھانہ بھون میں دوپہر کے وقت حضرت خواجہ صاحب اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے اور متوسلین پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صاحب جو اسی روز بعد ظہر رخصت ہونے والے تھے بغرض ملاقات حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کو بٹھایا۔ ان سے اپنا کلام سنا اور اس قطعے کو خود بھی بار بار پڑھتے رہے اور ان سے بھی پڑھواتے رہے۔

مجھے دوست چھوڑیں سب کوئی مہرباں نہ پوچھے
مجھے میرا رب ہے کافی مجھے کل جہاں نہ پوچھے
شب و روز میں ہوں مجذوب اور یاد اپنے رب کی
مجھے کوئی ہاں نہ پوچھے مجھے کوئی ہاں نہ پوچھے (۱)

---

(۱) القول العزیز۔ حصہ دوم۔ لاہور۔ ۱۹۶ ص ۱۰۲

تقویٰ و طہارت

حقوق العباد کی ادائیگی

تقویٰ وطہارت

حضرت تھانوی سے تعلق کے بعد خواجہ صاحب کے اندر دین کا خاص اہتمام ہو گیا تھا۔ خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ خواجہ صاحب کے تقویٰ وطہارت کے متعلق فرماتے ہیں "تقویٰ وطہارت بڑی چیز ہے مگر آج کل ہر طبقے میں اس کی کمی ہے۔ علماء و مشائخ میں اس کی کمی بہت مذموم ہے اور خدا کا فضل ہوتا ہے تو غیر علماء کو یہ دولت نصیب ہو جاتی ہے۔ دیوبند مدرسہ میں خواجہ صاحب کا قیام ہوا۔ شب کا وقت ہوا۔ خواجہ صاحب نے مہمان خانہ میں خادم مدرسہ کو روشنی کرنے کا حکم دیا خواجہ صاحب نے کہا کہ اگر یہ لالٹین اور تیل آپ کا نجی ہے تو پھر تو کوئی حرج نہیں اور اگر مدرسہ کا ہے تو میں خود انتظام کر لوں گا۔" (۱)

ایک دفعہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اودھ کے ایک مسلمان تعلقدار کے ہاں زبردستی پہنچائے گئے جہاں انہوں نے مجبوراً کھانا بھی کھایا۔ رات بھر کی شعر خوانی کے بعد جب وہ واپس ہوئے تو ایک صاحب سے انہوں نے پوچھ لیا کہ تعلقدار صاحب کی آمدنی میں ناجائز ذریعہ تو شامل نہیں ہے اطمینان دلایا گیا کہ وہ سود وغیرہ نہیں لیتے۔ جزئیات تک خواجہ صاحب نے پوچھ ڈالیں، اور جب یہ معلوم ہوا کہ لگان وغیرہ کی وصولی میں ان تعلقدار صاحب کے یہاں بھی عام زمینداروں اور تعلقداروں کی طرح کاشت کاروں پر ظلم کیا جاتا ہے تو سب کی نظروں سے بچ کر گرم پانی کرا کر استفراغ کیا اور جب اطمینان

---

(۱) اشرف علی تھانوی۔ الافاضات الیومیہ۔ جلد پنجم۔

ہو گیا کہ رات کی غذا کا کوئی ذرہ معدے میں باقی نہیں رہا تو ہلکان ہو کر بستر پر لیٹ گئے (۱)

حضرت خواجہ صاحب تقریباً ایک خاص دھن میں شورش آمیز عشقیہ اشعار و مضامین سے اہل مجلس کو تڑپاتے رہتے ۔ جونپور سے بنارس حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور ڈپٹی علی سجاد صاحب دامت برکاتہم ایک تھرڈ کلاس ڈبے میں سفر کر رہے تھے ۔ صبح کی نماز یا تہجد کی نماز حضرت مجدد صاحبؒ اور دیگر حضرات نے ڈبے کے فرش پر ادا کی ۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ کو اس ڈبہ کی پاکی پر شبہ ہوا اور دریافت فرمایا کہ اس پر نماز ہو جائے گی ۔ اس پر حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا ۔ " خواجہ صاحب کو تو تقویٰ کا ہیضہ ہو گیا ہے ۔ " (۲)

تقویٰ و طہارت

ایک مرتبہ تھانہ بھون سے واپس اپنے گھر جا رہے تھے ۔ ایک مقام پر گاڑی تبدیل کرنی پڑتی تھی چنانچہ اسٹیشن پر اسٹیشن ماسٹر سے کہا کہ میرے پاس آتا زائد سامان ہے ۔ میرے سامان کا وزن کر لیں تاکہ میں کرایہ ادا کر سکوں ۔ سامان کچھ زیادہ نہیں تھا ۔ لہٰذا اسٹیشن ماسٹر نے خواجہ صاحب سے کہا کہ کوئی بات نہیں نے جائیں مگر آپ اس بات پر مصر رہے کہ سامان کا وزن کروایا جائے ۔ اس بات کو دیکھ کر اسٹیشن ماسٹر ایک دوسرے آدمی سے انگریزی زبان میں کہنے لگا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص نشے میں ہے ۔ خواجہ صاحب نے فرمایا " ہاں مجھے حقوق العباد کی ادائیگی کا نشہ چڑھا ہوا ہے " اور سامان کا وزن کرانے کے بعد کرایہ ادا کر کے ہی سفر دوبارہ شروع کیا ۔ " (۳)

آپ کے صاحبزادے جناب خواجہ محبوب الحسن غوری جن کی عمر اس وقت اس عمر سے جو ریلوے قانون کے مطابق نصف ٹکٹ کے لئے مقرر کی گئی تھی صرف چند روز تجاوز کر گئی تھی ۔ انہوں نے ریلوے

(۱) بہ روایت رضا انصاری صاحب ۔

(۲) بہ روایت ڈپٹی علی سجادؒ مجاز صحبت

(۳) بہ روایت مولانا محمد عرفان

میں سفر کیا اور میرٹھ سٹیشن پر اترے ۔خواجہ صاحب اسٹیشن پر موجود تھے ۔چونکہ نصف ٹکٹ نہیں خریدا گیا تھا لہٰذا آپ نے نصف ٹکٹ جہاں سے ان کے صاحب زادہ اور دیگر افراد سفر کر کے آئے تھے خرید ا اور اس کو پھاڑ دیا۔ (۱)

حضرت مولانا محمد داؤد یوسف کی طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ خواجہ صاحب کی اہلیہ سخت بیمار ہوئیں ۔غالباً ان کا قیام تھانہ بھون میں تھا۔علاج کے لئے سہارن پور کے سول ہسپتال میں علاج کی ضرورت پیش آئی ۔اکثر عصر کے بعد مولانا داؤد یوسف بھی ہسپتال عیادت کے لئے جایا کرتے تھے ۔ایک مرتبہ مولانا تنہا تھے ۔خواجہ صاحب نے ان سے فرمایا کہ اپنی اولاد میں سے کچھ کو اپنی زندگی میں زیادہ دینا چاہتا ہوں شرعاً تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے ۔مولانا صاحب نے فرمایا کہ میں تو طالب علم ہوں کسی ماہر سے دریافت فرمائیں ۔فرمانے لگے کہ شائد تم نے یہ مسئلہ اپنے استادوں سے سنا ہو یا کسی کتاب میں دیکھا ہو معلوم ہو تو بتلا دو۔مولانا داؤد یوسف صاحب نے فرمایا کہ ایسا کرنا غالباً مکروہ ہے ۔کہنے لگے ”تو نہیں دوں گا“مولانا نے فرمایا کہ ”مکروہ تنزیہی ہے“۔ فرمایا کہ ”مکروہ تنزیہی بھی تو بچنے کی چیز ہے ۔“ (۲)

آپ نے دفتر کی قلم دوات سے کبھی اپنا ذاتی خط نہیں لکھا، نہ دفتر کے چپراسی سے کوئی ذاتی کام کروایا نہ ذاتی کام کے لئے دفتر کی کرسی میز یا فرنیچر استعمال کیا۔

ایک دفعہ دفتر سے گھر آئے تو معلوم ہوا کہ ان کے صاحبزادے نے ہوائی بندوق سے کبوتر مارا ہے ۔نشانہ صحیح لگنے سے بہت خوش ہوئے مگر یکدم گھبرا کے کہنے لگے کہ دکھاؤ تو وہ کبوتر پالتو ہے یا جنگلی؟ دیکھا تو پالتو تھا۔پریشاں ہو کر کبوتر ہاتھ میں لے کر گھر گھر پوچھتے پھرے کہ یہ کبوتر کس کا ہے جب مالک کا پتہ چل گیا تو کبوتر کی قیمت دے کر اور معافی مانگ کر معاملہ ٹھیک ٹھاک کیا تب چین سے بیٹھے ۔جب معائنہ کے دورے پہ جاتے تو آدھے راستہ خود گھوڑے پر سوار ہوتے آدھے راستہ پر چپراسی ۔جب کسی سکول میں خیمہ زن ہوتے تو حالت یہ ہوتی کہ چپراسی آٹا گوندھ رہا ہے تو خواجہ صاحب آگ دھونک رہے ہیں ۔کسی

---

(۱) بہ روایت خواجہ محبوب الحسن غوری صاحب [صاحبزادہ حضرت خواجہ صاحب حال مقیم سندھ]

(۲) بہ روایت مولانا محمد داؤد یوسف صاحب دامت برکاتہم خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامتؒ ۔[حال مقیم ربا]

کو پاس نہیں آنے دیتے تھے تاکہ کل معائنہ میں اس کی بے جا رعایت نہ کرنی پڑے [۱]

حضرت سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

خواجہ صاحب کو بچپن سے نیک تھے، علی گڑھ کالج میں داڑھی رکھ کر داخل ہوئے اور بسلامت نکل آئے اور بیعت کے بعد تو اُن کا تقویٰ اچھے اچھے مولویوں کو شرماتا تھا۔ پوری سرکاری ملازمت اور دوروں میں کبھی کسی سے کوئی چیز بے قیمت قبول نہیں کی، یہاں تک کہ مٹی کے گھڑوں کی قیمت بھی ادا کرتے تھے، ملازمت کے زمانے میں ایک دفعہ ایک لڑکا ساتھ تھا جس کی عمر گو ۱۲ سال تھی مگر دیکھنے میں چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اہل کار کا اصرار تھا کہ اس کا ٹکٹ نصف چل جائے گا۔ مگر انہوں نے اس کو قبول نہیں کیا اور پورا ٹکٹ لیا۔ اہلِ دُنیا اس کی معصومیت پر ہنستے رہے وہ خوش تھے کہ بحمد اللہ خیانت کے جرم سے پاک رہا۔ [۲]

ایک مرتبہ شاہدرہ سہارن پور ریلوے میں جو ایک پرائیویٹ کمپنی تھی۔ آپ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے بیٹھنے لگے تو اپنے اسباب کو غور سے دیکھا کہ ریلوے کی اجازت سے زیادہ تو نہیں ہے، پھر فرمایا کہ اس ریل میں خاص طور سے دیکھ لیتا ہوں، گورنمنٹ ریلوے میں تو خیر کچھ تاویل بھی چل جاتی ہے [۳]

دیانت

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھنؤ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ آپ کے پاس مُرغی کا ایک خوبصورت جوڑا تھا، اس میں عیب یہ تھا کہ پاس آنے والے کے اس زور سے لات مارتا تھا کہ زخمی کر دیتا تھا، اس وجہ سے آپ نے اس کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا، لیکن یہ کام اپنے ملازم کے سپرد کرنے کی بجائے

---

[۱] بہ روایت مولانا ماسٹر منظور احمد صاحب خلیفہ مجاز حضرت حکیم الامت رح۔

[۲] حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح۔ فراقِ مجذوب، معارف اعظم گڑھ۔ یادِ رفتگان ص ۳۰۵

[۳] حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رح۔ فراقِ مجذوب، یادِ رفتگان ص ۳۰۶

بازار نخاس میں مرغی کا یہ جوڑا دبائے خود بازار میں تشریف لے گئے وہاں جو بھی اس کی قیمت دریافت کرتا تھا اسے اپنی زخمی پنڈلی دکھا کر بتلادیتے تھے کہ اس میں یہ عیب بھی ہے کہ لات مار کر پاس آنے والوں کو بری طرح زخمی کر دیتا ہے۔ (۱)

حقوق العباد

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں حقوق العباد کی ادائیگی پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے شیخ کے مانند حقوق العباد کی ادائیگی کا بے حد خیال رکھتے تھے ایک مرتبہ لکھم پور کے دورہ پر تشریف لائے۔ لکھم پور میں حضرت قدس سرہ کے ایک مجاز صحبت حافظ عبدالولی صاحب نے حکیم کرم حسین خاں صاحب کے ذریعہ سے درخواست کی کہ میرے پاس بھی دورہ میں تشریف لائیں۔ خواجہ صاحب نے اس کو منظور فرمایا۔ حکیم صاحب اور دیگر احباب بھی ساتھ تھے۔ لکھم پور اور دھورہرہ جہاں حافظ عبدالولی صاحب کا قیام تھا۔ اس کے درمیان ندیاں پڑتی تھیں۔ ایک جگہ کشتی پر اترنا ہوتا تھا۔ حکام کے لئے عبورانہ نہیں ہوتا تھا لیکن خواجہ صاحب نے ٹھیکہ دار سے دریافت کیا جب اس نے تین روپے مانگے تو فرمایا کہ یہ تو بہت گراں پڑا۔ حافظ صاحب نے کہا کہ آپ کو دینے ہی نہیں چاہیئے تھے۔ حکومت نے حکام کے لئے بلا محصول اترنے کا انتظام اور قانون رکھا ہے۔ فرمایا نہیں ہم دیں گے۔ راستہ میں ایک جگہ کھونٹے گڑے ہوئے تھے۔ دریائی علاقہ تھا۔ کار نکلنے میں دقت بھی۔ حافظ صاحب نے کھونٹے اکھڑوانے چاہے۔ کاشت کار بھی تیار ہو گیا لیکن آپ نے منع کیا اور دوسری طرف سے گھما کر کار نکالی۔ حافظ صاحب سے فرمایا کہ تم کو کیا حق ہے کھونٹے اکھڑوانے کا۔" (۲)

دیوالی کے تیوہار کا زمانہ تھا تین دن کی چھٹی میں حافظ عبدالولی صاحب کے یہاں تشریف لائے

---

(۱) بہ روایت حضرت حکیم سید محمد ابراہیم رزمی صاحب

(۲) بہ روایت حضرت حافظ عبدالولی صاحب مجاز صحبت حضرت حکیم الامت

حکیم کرم حسین صاحب بھی ساتھ تھے۔ حافظ صاحب ان تمام حضرات کو مہراوچ سے ۱۸ میل دور ایک جگہ لے گئے، بہت بارش شروع ہوگئی۔ حافظ صاحب کے بیٹھنے کی جگہ پر ایک بہت لمبا سا چھپر پڑا ہوا تھا۔ اس میں حافظ صاحب نے سب کے لئے کرسیاں ڈلوادیں۔ خواجہ صاحب تشریف لائے۔ اور بیٹھ گئے مگر خاموش دو ایک مرتبہ یہ الفاظ فرمائے کہ انسپکٹر صاحب بڑی شان سے رہتے ہیں۔ حافظ صاحب نہ سمجھ سکے۔ کھانے کا وقت آگیا۔ کمرے میں فرش رکھا گیا تھا۔ پلنگ بھی تھے۔ وہاں تشریف لائے تو پھر وہی فرمایا۔ حافظ صاحب نے فرمایا کہ اپنے بزرگ کے لئے کچھ کرنا چاہیئے، اتنی کرسیاں تو میری ہیں، اتنی ریاست کی ہیں دوسری کچھ مانگ لی ہیں۔ دریاں بھی ریاست کی ہیں جب کھانے پر تشریف لائے تو بجائے اس کے تشریف رکھتے بلکہ پلنگ کے نیچے جا لیٹے۔ جب حافظ صاحب نے یہ تفصیل بیان کی تو خوش ہوئے اور یہ شعر فرمایا ؎

کیا دو روزہ زندگی کا یہ قرینہ چاہیئے
مرنے والے کی طرح دنیا میں جینا چاہیئے (۱)

حضرت خواجہ صاحب کے صاحبزادوں نے ٹینری (چمڑے کی رباغت) کا کارخانہ کھولا تھا۔ مولانا عبدالولی صاحب نے بھی دیکھنے کے لئے کہا۔ راستے میں مکانوں پر حافظ صاحب کی نظر پڑی۔ فوراً حافظ صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا ؎

کبھی اغیار سے خالی کرے گا بھی کنار آخر
ترے پہلو میں ہوگا بھی کبھی تیرا نگار آخر

حافظ صاحب ریٹائر ہونے کے بعد خواجہ صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ رات کو ۹ بجے گاڑی پہنچی۔ بہت خوش ہوئے اور تقریباً ۱۲ بجے شب تک باتیں کرتے رہے۔ پھر فرمایا اچھا اب آرام کیجئے۔ پلنگ پر بہت ہی عمدہ پلنگ پوش پڑا ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے دل میں خیال کیا کہ میں اس قابل کہاں۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اپنا بستر استعمال کرلینا اسے ہٹا دو۔ دوسرے دن پھر خواجہ صاحب نے اس

(۱) حضرت حافظ عبدالولی صاحب

کمرے میں جہاں صوفہ سیٹ لگا ہوا تھا فرمایا یہاں بیٹھئے اور آرام کریں اور ساتھ ہی فرمایا کہ ہم تو یہاں لکھ کر لگادیں گے کہ ؎

یہ ترا خانہ رنگیں یہ ترا بستر زریں
بہ فرش خاک سونا ہے تجھے زیر مزار آخر
تن خاکی پہ تا کے یہ لباس زرنگار آخر
یہ ہوگا ایک دن زیر کفن مشت غبار آخر (۱)

شانِ تواضع وخاکساری

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں " ان کا دوسرا وصف خاکساری اور تواضع تھا۔ چپراسیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ بازار سے چیز خرید کر اپنے ہاتھ سے اٹھا کر لانے میں تامل نہ تھا۔ اس قسم کے کام جو لوگ اپنے لئے توہین سمجھتے تھے اس بے تکلفی سے انجام دیتے تھے کہ چہرہ پر میل نہ آتا تھا اس سے زیادہ یہ کہ وہ انسپکٹر آف سکولز ہیں۔ ساتھ ہی متعدد ماسٹر اور سکولوں کے ہیڈ ماسٹر ہیں اور وہ چلتے ہوئے خود بازار سے کوئی مٹھائی یا کھانے کی چیز خریدتے ہیں خود بھی کھاتے ہیں اور ان کو بھی کھلاتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ میرے لئے یہ سادہ اسلامی شکل وصورت تحقیر کی بجائے عزت کا سامان بن گئی ہے۔ انگریز افسر بھی عزت کرتے ہیں۔ دیانت دار سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ انھوں نے میرے کام کو پسند کیا ہے۔ سرکار نے بے وجہ خان بہادر نہیں بنایا۔ ترقی پر ترقی دی اور کسی موقع پر بھی میری داڑھی اور لمبا کرتا میری کسی ترقی میں حارج نہیں ہوا۔ (۲)

---

(۱) حضرت حافظ عبدالولی صاحب

(۲) سید سلیمان ندوی یادِ رفتگان (کراچی ۱۹۸۳ء) ص ۳۰۶

ذکر اللہ میں انہماک

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں "ایک سفر میں دوپہر کے کھانے پر متعدد احباب جمع تھے اور خواجہ صاحب اپنی عادت کے مطابق اشعار پڑھنے میں مست تھے کیونکہ خواجہ صاحب کے اکثر اشعار ان کے حالات و مواجید کی پیداوار ہوتے تھے جب ان کو پڑھتے تو خود بھی وجد کی کیفیت طاری ہوتی تھی اور سننے والوں پر بھی۔ اشعار کے ساتھ دوستانہ بے تکلفی ہنسی دل لگی کا سلسلہ بھی کچھ دیر تک چلتا رہا۔ اس کے بعد خواجہ صاحب نے اچانک مجھ سے سوال کیا کہ بتلاؤ اس وقت کس کو ذکر اللہ سے غفلت ہوئی۔ ہم نے کہا کہ ہم تو غفلت میں مبتلا تھے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا الحمد للہ مجھے غفلت نہیں ہوئی اس وقت اندازہ ہوا کہ خواجہ صاحب خلوت در انجمن کے صحیح مصداق اور قوی نسبت کے حامل تھے کہ اتنی طویل ہنسی دل لگی کے درمیان بھی وہ ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوئے۔"

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "خواجہ صاحب ایک جلسہ میں ۲۴ ہزار بار ذکر اسم ذات کرتے تھے اور پھر بھی فرماتے تھے کہ نہ جانے ایمان ہے کہ نہیں۔" (۱)

رعب و ہیبت منجانب اللہ

سادگی بے تکلفی عجز و انکسار ہنسی، مذاق کے باوجود اللہ تعالیٰ نے خواجہ صاحب کو ایک ایسا رعب و دبدبہ عطا فرمایا تھا کہ اکثر کالجوں، سکولوں کا معائنہ فرماتے وقت بعض ٹیچر بے ہوش تک ہو جاتے تھے۔ عام طور پر لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب نے ایک شعر اپنے شیخ حضرت تھانوی کی خدمت میں تحریر کیا تھا۔

ہزار رحمت ہزار رحمت مگر نہیں دم زدن کی جرأت
یہ سادگی میں بھی رعب و ہیبت اسی جلالت مآب میں ہے

---

(۱) عزیز الرحمٰن، القول العزیز (لاہور، ۱۹۶۷ء) ص ۶۳

مگر یہ شعر اس موقعہ پر خود خواجہ صاحبؒ کے حال پر بھی منطبق ہے۔ حضرت خواجہ صاحب اپنے ماتحتین کی اصلاح بھی عجیب انداز میں فرماتے تھے۔ ایک اردو اسکول کی کلاس میں معائنہ فرما رہے تھے۔ کلاس ٹیچر۔ ہیڈ ماسٹر۔ ڈپٹی انسپکٹر مدارس سب موجود تھے۔ ایک طالب علم سے درسی کتاب پڑھوائی۔ لفظ یتیم آیا۔ معنی دریافت فرمائے گئے۔ طالب علم نے جواب دیا کہ جس کے باپ زندہ نہ ہوں اس کو یتیم کہتے ہیں کلاس ٹیچر سے دریافت فرمایا اس نے بھی یہی جواب دیا۔ ہیڈ ماسٹر سے پوچھا اس نے بھی یہی جواب دیا۔ فرمایا گیا آپ کے باپ زندہ ہیں جواب دیا گیا نہیں۔ فرمایا پھر آپ بھی یتیم ہیں۔ اس کے بعد فرمایا میرے بھی باپ زندہ نہیں۔ میں بھی یتیم ہوں۔ غرض کہ اس جگہ جتنے آدمی ہیں سب یتیم ہیں۔ سب سنکر خاموش ہو گئے۔ شرمندہ ہو کر رہ گئے۔ پھر فرمایا جس معصوم نابالغ بچہ کے باپ زندہ نہ ہوں اس کو یتیم کہتے ہیں نہ کہ ہم جیسے بن باپ کے بوڑھوں کو۔

خواجہ صاحبؒ کی دلسوزی

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفہ جناب ماسٹر محمد شریف صاحب حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب کی دلسوزی کے دو واقعات تحریر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں "حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بنی نوع انسان کے بہت بڑے بہی خواہ تھے۔ خصوصاً مسلمانوں کے لئے تو قلب میں عجیب دلسوزی شفقت اور ہمدردی تھی۔ کسی کو بھی کوئی تکلیف پہنچتی تو بے چین ہو جاتے تھے۔ اس ناکارہ پر حضرت خواجہ صاحب کے بے شمار احسانات ہیں۔ میری زندگی کا بہترین حصہ انگریزی اور سائنس میں صرف ہوا۔ دینی علم نام کو بھی نہ تھا۔ سکول میں انگریزی ماسٹر تھا۔ اس سکول میں ایک صاحب تعطیلات میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ پہلی اہلیہ کا انتقال ہو گیا۔ میں اکیلا رہ گیا۔ سکول میں جب تعطیلات ہوئیں تو میرے ساتھی تھانہ بھون جانے کو تیار ہوئے۔ میں نے کہا کہ اکیلا کہاں پڑا رہوں گا، چلو دیکھیں تھانہ بھون میں کیا چیز ہے۔ خانقاہ میں قدم رکھا تھا کہ دنیا بدل گئی۔ حضرت خواجہ صاحب نے میرے ساتھی کی پہلی ملاقات پر بہت مدد کی تھی۔ میرے ساتھی اجازت کا خط لے کر حضرت والا کے پاس

سہ دری میں کھڑے ہو گئے۔ حضرت خواجہ صاحب کے اشارہ فرمانے پر بیٹھ گئے ورنہ مواخذہ یقینی تھا۔ مجھ نالائق کو کیا تمیز تھی کہ دینی حلقوں کے کیا آداب ہوتے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب ہمیشہ بہت دل سوزی سے بات بتاتے گرتا پڑتا مواخذے کھاتا چلتا رہا۔ خط ۸۳ مورخہ ۱۱ ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۰ھ والے خط پر حضرت نے مجھے بیعت اور تلقین کی اجازت دے دی۔ اب میں حضرت والا کو یاد ہو گیا۔ بدتمیز تھا ہی بڑی احمقانہ غلطیاں کیں۔ حضرت والا متنبہ فرماتے رہے۔ ایک خط پر سخت مواخذہ ہوا۔ اب میں نے عجیب حرکت کی۔ حضرت والا بعد نماز فجر سہ دری میں خلوت میں نوافل و اوراد میں مشغول تھے کہ میں جا دھمکا اور حضرت والا کے نزدیک بیٹھ کر عرض کیا "حضرت مجھے وہم سا ہو گیا ہے کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔

حضرت والا نے نہایت ناراضی سے فرمایا " نالائق اگر میں تم سے ناراض ہوتا تو تمہاری تعلیم کیوں جاری رکھتا۔ کیا میں تم لوگوں کی خوشامدیں کروں۔ یہ مجھ پر سوءظن کیوں" میں نے عرض کی " حماقت ہوئی للہ معاف کر دیں" حضرت نے فرمایا " نالائق یہاں سے دور ہو جاؤ۔ اور اپنی شکل مجھے مت دکھاؤ۔ میں اٹھ کر جانے لگا تو بلند آواز سے فرمایا " چلو مسجد میں " میں مسجد میں چلا گیا۔ حضرت والا بے تابانہ اٹھے اور باہر آ کر حرم کے اوپر بہت بے تابانہ پھرنے لگے اور بلند آواز سے فرمایا " خواجہ صاحب " خواجہ صاحب فوراً حاضر ہوئے۔ فرمایا ایک صاحب مسجد میں ہیں ان سے پوچھیے کہ تم کو کیوں شبہ ہوا کہ میں تم سے ناراض ہوں۔ میں نے خواجہ صاحب سے کہا کہ کچھ خطوط میں مواخذہ کی وجہ سے خواجہ صاحب نے حضرت والا کو میرا جواب پہنچا دیا۔ حضرت نے فرمایا یہ کوئی جواب ہے اگر کوئی بدعنوانیاں کرے تو کیا میں مواخذہ نہ کروں۔ جب اس کو یہاں آنے کی مکاتبت کی مخاطبت کی سب اجازت تھی اور میں اسے تعلیم کر رہا تھا تو یہ شبہ محض سوءظن ہے۔ اس نالائق کی اس حرکت سے میرے سر میں شدید درد ہو گیا۔ اس کو کہہ دیجیے کہ میں اس قابل نہیں رہا اپنا تعلق کسی اور جگہ پیدا کرے۔ اس واقعہ کو پڑھنے والے حضرات اندازہ فرما سکتے ہیں کہ یہ ارشاد میرے لئے کتنا اثر رکھتا تھا۔ میرا سب کچھ مجھ سے چھین رہا تھا اور میں کہیں کا نہ رہتا لیکن شاید مجھے اس وقت کیا ہو گیا دل پتھر سا ہو گیا۔ آنکھیں اکثر آنسو بہایا کرتی تھیں لیکن اب ایک آنسو بھی آنکھوں سے نہ نکلا اور میں نے بڑی ہمت سے کہا کہ خواجہ صاحب حضرت کو کہہ دیں کہ اگر یہ حکم ہے تو میں تعمیل کروں گا لیکن حضرت کی جدائی کا

مجھ سے تحمل نہ ہو سکے گا۔ اب جیسے کہیں کر لوں۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر کان لگا کر سن رہا تھا۔ خواجہ صاحب میرے الفاظ نہایت عمدہ انداز سے پہنچا رہے تھے اور ساتھ ہی بہت انکساری سے یہ کہہ رہے تھے "حضرت ان کو تو حضرت نے اجازت (تلقین وبیعت) دی ہے۔ حضرت اب کہاں جائیں گے۔ لہٰذا انہیں معاف کر دیں حضرت لہٰذا انہیں معاف کر دیں" اللہ تعالٰی نے مجھ پر فضل عظیم فرمایا شاید حضرت کو خواجہ صاحب کی دل سوزی اثر کر گئی۔

حضرت خواجہ صاحب کی دلسوزی کا ایک اور واقعہ تحریر کرتا ہوں۔ ایک نووارد صاحب حضرت اقدس کی مجلس میں دیر تک بیٹھے رہے اپنا تعارف نہ کرایا۔ حضرت نے اپنے خادم سے فرمایا ان سے پوچھیئے مجھے ملے ہیں یا نہیں۔ معلوم ہوا نہیں ملے۔ حضرت نے فرمایا اتنی دور سے آئے خرچ کیا تکلیف اٹھائی لیکن تعارف نہ کرایا تو کیا فائدہ۔ کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو فرمایا چلے جاؤ اور دوبارہ نہ آنا جب وہ صاحب جانے لگے فرمایا قسم کھاؤ کہ دوبارہ نہیں آؤں گا۔ انہوں نے کہا خدا کی قسم دوبارہ نہیں آؤں گا۔ اس کے بعد وہ صاحب چلے گئے۔ حضرت خواجہ صاحب بے چین ہو گئے اور حضرت کی خدمت میں بڑی بے قراری سے عرض کیا "حضرت حضرت یہ صاحب تو ایک بے بہا نعمت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گئے"۔ حضرت نے فرمایا "اے خواجہ درد نیست ورنہ طبیب ہست۔ کیا قسم کا کفارہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت خواجہ صاحب نے کہا حضرت شاید وہ بات نہ سمجھ سکیں اگر اجازت ہو تو میں اس کو بتا آؤں حضرت نے فرمایا میں منع نہیں کرتا اور خواجہ صاحب ان کو بتانے کے لئے سٹیشن کی طرف دوڑ نکلے۔" (۱)

ملفوظات

ایک مرتبہ اپنے اس شعر کی خود ہی یوں تشریح فرمائی۔

" عرش بریں ہے زاہد و سجدہ گہ نمازِ عشق
تم سے میں کیا بیان کروں مرتبہ نیازِ عشق

---

(۱) تحریر حضرت ماسٹر محمد شریف صاحب خلیفہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

فرمایا" حدیث شریف میں آیا ہے حضور کا ارشاد ہے کہ نمازی جب سجدہ میں سر رکھتا ہے تو اس کا سر اللہ کے قدموں میں ہوتا ہے اور جس جگہ اللہ کے قدم رکھے جائیں اسی کا نام عرش ہوتا ہے تو فرمایا عشق کی نیاز مندی کا درجہ یہ ہے کہ عاشق جب اپنی نیاز مندی میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے جس سے زیادہ اس کی صورت سے عاجزی اور مٹنا ناممکن ہے یعنی ناک اور ماتھے کو زمین پر رکھتا تو اس جگہ کو اللہ تعالیٰ عرش سے بھی بلند فرما دیتے ہیں"۔ (۱)

فرمایا" اصل لطف تو اللہ کے تعلق اور اس کی یاد اور دین میں ہے"۔

فرمایا کہ جب نفس میں گناہ کا تقاضا پیدا ہو تو بھانپ جائے کہ لوٹ کا وقت آگیا ہے یعنی اس تقاضا کا مقابلہ کرنے میں مشقت ہوگی اور مشقت پر ملے گا ثواب اس طرح یہ تقاضا قرب حق کا ذریعہ بن جائیگا"

فرمایا" جب گناہ کا تقاضا پیدا ہوتا ہے تو رحمت خداوندی متوجہ ہوتی ہے اگر ہمت کر کے اس تقاضا کے خلاف عمل کرے تو رحمت نازل ہوتی ہے ورنہ واپس چلی جاتی ہے"۔ (۲)

حضرت خواجہ صاحبؒ الہ آباد میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے تعینات تھے۔ ایک دفعہ ڈائریکٹر تعلیمات نے جو انگریز تھا انسپکٹروں کا اجلاس بلایا۔ اتفاق سے اجلاس شروع ہونے کا وقت اور نماز مغرب کا ایک وقت تھا۔ حضرت خواجہ صاحب نے نماز کو ترجیح دی اور قریبی مسجد میں تشریف لے گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد بھول گئے کہ اجلاس میں شرکت کرنا ہے اور اوابین پڑھنے لگے پھر ذکر میں مشغول ہو گئے جب اجلاس کا خیال آیا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔ جلدی جلدی وہاں پہنچے جہاں اجلاس ہو رہا تھا۔ ناظم تعلیمات نے جونہی مجذوب صاحب کو دیکھا احتراماً کھڑا ہو گیا۔ ناظم کے کھڑے ہوتے ہی تمام شرکائے اجلاس بھی کھڑے ہو گئے اور جب تک مجذوب صاحب اپنی نشست پر نہ بیٹھے سب لوگ کھڑے رہے۔ پھر ناظم نے کارروائی کے اعادہ کا حکم دیا تاکہ خواجہ صاحب کو معلوم ہو جائے کہ کن مسائل پر گفتگو ہو چکی ہے۔ اس سے مجذوب صاحب کی مقبولیت عنداللہ و عندالخلق ظاہر ہے۔ (۳)

---

(۱) بر روایت مولانا عرفان احمد صاحب (۲) القول العزیز۔ حصہ دوم ص ۲۳

(۳) تحریر حکیم ابراہیم صاحب رزمی۔

حضرت مولانا حافظ عبدالولی صاحب سے ایک حاکم اعلیٰ نے خواہش کی کہ وہ اٹھارہ ہزار کے قرضدار ہیں اس کا انتظام کر دو تو آپ کو ترقی دی جائے گی۔ وہ دورے پر آئے۔ حافظ صاحب نے کہا کہ میں نے تو دربار کے لئے کوٹ بھی نہیں بنوایا لیکن ان کا سیکرٹری اس افسر کو بھرتا رہا۔ حافظ صاحب کی طلبی ہوتی رہی لیکن حافظ صاحب حاضر نہ ہوئے۔ اس پر یہ بات عام ہوگئی کہ حافظ صاحب کو یا معطل کر دیا جائے گا یا برطرف ہو جائیں گے۔ حافظ صاحب کے لڑکوں نے گھبرا کر خواجہ صاحب اور حضرت حاجی منشی رحمۃ اللہ علیہ اور حق داد خان صاحب کو اطلاع دی۔ دونوں جگہ سے جواب آیا کہ اطمینان رکھو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود سکرٹری کو راجہ نے علیحدہ کر دیا ہے حافظ صاحب کی نیک نامی ہوئی۔ جب حافظ صاحب خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خواجہ صاحب نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ شعر ترے اوپر صادق آتا ہے ؎

یہ کیا غضب ہے یہ کیا غضب ہے کہ در کی مجذوب سے طلب ہے
وہ صاحب سوز و ساز اب ہے وہ صاحب سیم و زر نہیں ہے

ایک دفعہ حکیم سید محمد ابراہیم رزمی صاحب، مولانا حبیب اللہ صاحب، حضرت خواجہ صاحب منسوری پہاڑ پر گئے۔ ایک روز نماز عصر کے بعد ایک آبشار پر پہنچے۔ خواجہ صاحب کافی دیر تک شعر سناتے رہے یہاں تک کہ نماز مغرب کا وقت قریب آگیا چونکہ وقت کم تھا اس لئے واپسی پر مجذوب صاحب نے ارشاد فرمایا کہ دوڑو گے تو پھر نماز ملے گی۔ چنانچہ سب نے دوڑنا شروع کیا۔ حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب بوجہ جسامت و کمزوری و پیری پیچھے رہ گئے۔ کچھ مغرب زدہ عورتیں گھوم رہی تھیں۔ مولانا حبیب اللہ کو دیکھ کر ان میں سے کسی نے کہا کہ یہ بھی اسی غول کا معلوم ہوتا ہے۔ یہ واقعہ سن کر حضرت مجذوب صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح میدان حشر میں ملائکہ پہچان لیں گے کہ یہ شخص فلاں کی امت کا ہے۔ (۱)

پیسے کی قدر و قیمت

حضرت تھانوی قدس سرہ نے فرمایا "ایک مرتبہ خواجہ صاحب سفر میں تھے۔ سہارن پور سٹیشن

(۱) بروایت حضرت حکیم سید ابراہیم صاحب رزمی

پر ٹکٹ خریدنے کا ارادہ کیا تو ایک پیسے کی کمی تھی اب کیا کریں مانگ نہیں سکتے ملنے والا کوئی پاس نہیں
مدرسہ سٹیشن سے دور اور نوکری پہ حاضری اسی ٹرین پہ سوار ہونے پر موقوف ۔ اتفاق سے ان کی جیب سے
ایک کارڈ نکل آیا۔ اس زمانہ میں کارڈ کی قیمت ایک پیسہ ہوتی تھی۔ مسافروں سے التجا کی کسی کو رحم آگیا خرید
لیا ورنہ بدون ایک پیسہ سارا کرایہ بیکار تھا۔ خواجہ صاحب کہتے تھے کہ اس روز معلوم ہوا کہ پیسہ بھی خدا
کی نعمت ہے۔ (۱)

---

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی ۔ الافاضات الیومیہ جلد ششم ص ۲۸۱ ۔

خواجہ صاحب

کی

شاعری

کسی شاعر کے کلام کی اشاعت کے ساتھ یہ ضروری نہیں ہے کہ تقریظ یا تبصرہ بھی ساتھ ہی ساتھ جگہ پائے۔ مگر خواجہ مجذوبؒ کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ ہم کچھ نہ کچھ ان کو سمجھ لیں تاکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہو کہ انھوں نے کہا کیا ہے اور کیوں۔

صاحب کلام کی شخصیت درحقیقت اس ماحول کا پس منظر ہے جس سے کلام (بھی) متاثر ہے اور صاحب کلام بھی)

عموماً شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے لیکن (ایک قسم کا) تو وہ (شاعر) ہوتا ہے جو گرد و پیش کے موجودہ ممکنات بہ الفاظ دیگر موجود و مشہود اور ظاہر و باہر ماحول کو قبول کر لیتا ہے۔ اور اسی طرح اس کا پیرو ہو جاتا ہے جیسے ایک بہنے والا دھارے کے ساتھ بہہ جائے۔

ایسی حالات میں شاعر صرف وقتی اور آنی حالات و کیفیات جذبات کا مصور ہوتا ہے۔ وقت کے رخ کی ایک انداز خاص سے مورخی اس کا کام اور کارنامہ ہوتی ہے اور زیادہ دقیق نظر سے دیکھا جائے تو اس کا تفکر اور تصور سطحی اور کسی درجہ میں اضطراری ہوتا ہے۔ وہ اپنا ماحول پیدا نہیں کرتا بلکہ جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے اسی کا مملوک و مغلوب رہتا ہے۔

مجذوب کی شعریت کا تفکر اور تصور اس سطحیت اور عامیت سے فوق اور ممتاز ہے۔ عقل و حواس کی بیداری اور شعور و احساس کی حریت کامل کے ساتھ پہلے ذوق نے ایک ماحول اپنے لئے تجویز کیا پھر

اس کو اچھی طرح سوچ سمجھ کے مطلوبیت اور مرغوبیت کے درجہ کو پہنچایا اور بالآخر دل کو اس (ماحول) کی وہ دھن ہوگئی اور وہ لگن لگی کہ اپنے لئے ممتاز اور مخصوص ماحول پیدا کر کے جم گیا۔ یہ طرز وہی تھا جس کے لئے کسی کہنے والے نے کہا ہے ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار ہم مست

پیش لفظ میں مجدد طریق معرفت و مفسر آئین محبت حضرت حکیم الامت تھانویؒ (من بقربانش) کا یہ ارشادِ گرامی منقول ہے کہ خواجہ صاحب تصوف کے دقائق و غوامض کو اپنے اشعار میں ادا کرتے ہیں۔

حضرت اقدس تھانویؒ قدس سرہ سے زیادہ خواجہ مجذوب کو سمجھنے والا کون ہو سکتا ہے۔ "اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردہ تست" کا معاملہ تھا۔ مربی میں کیا ہے۔ اور اس کے امکانات کیا ہیں۔ یہ خالص مربی کے علم کے دقائق ہیں۔ حضرت اقدس کو خود بھی مجذوب سے وہ تعلق تھا کہ حضرت والا ان کو اکثر ہمارے خواجہ صاحب کہہ کر یاد فرمایا کرتے تھے۔ لقب مجذوب جو ماضی کے بعد حال اور مستقبل دونوں کا موضح اور ضامن ہوگیا۔ اس مشرف اور اشرف بارگاہ سے عطا ہوا تھا۔ اور سب سے زیادہ اس تعلق کے جمال اور مناسبت کے کمال کی آئینہ دار یہ خصوصیت ہے۔ کہ سینکڑوں جلیل القدر متبحر علماً متقی اور پاک نفس عملاً اور محب و محبوب حساً علماء کرام کے ہوتے ہوئے "اشرف السوانح" کی تالیف اور ترتیب بلکہ ایک درجہ میں تصنیف کی بیش قدر اور گراں مایہ خدمت مجذوب ہی سے لی گئی اگر مجذوب مزاج دان نہ ہوتے تو یہ کام ان سے کیوں لیا جاتا۔ اور مزاج دانی دلیل ہے۔ طریق دانی کی۔ اس روز کے بعد اس (راہ سلوک) میں ان کے جان راہ ہونے میں شک کی گنجائش کیا ہو سکتی ہے۔

چونکہ حضرت کے ارشاد گرامی میں لفظ سلوک آیا ہے۔ لہٰذا مجذوب اور کلام مجذوب کی تحری اور معرفت کے لئے "تصوف" سے روشناسی حاصل کرنا بھی ضروری ہوگیا۔ تصوف بیچارہ بھی اس درجہ بدنام اور اس قدر مجروح کیا گیا کہ عرف اور فہم عام میں اس کی ماہیت اور حقیقت ہی بدل گئی۔ عموماً شعراء نے اصلاحاً صوفیہ سے کلام میں گرمی حیات پیدا کرنے کی غرض سے فائدہ اٹھایا حالانکہ محض شاعر کو اس حقیقت کی ہوا بھی نہیں لگی نہ لگ سکتی ہے۔ بلا وقت فہم اور بغیر اجتہاد فکر کے لئے بے جانے بوجھے لکیر کے فقیر کی طرح شاعروں نے آڑان

لینا شروع کی۔ اور اس حقیقت کو پس پشت ڈال دیا۔ کہ یہ حال ہے محض اور اکیلا قال، نہ اس کا حامل ہے۔ نہ امین۔

محض حلقۂ شعراء ہی میں نہیں۔ بلکہ جو اپنے کو علمبرداران تصوف کہتے ہیں۔ اور کہلاتے ہیں۔ اگرچہ متصوفین میں بھی نادان دوستی اور بے علمی سے اس دریا بے بہا کی بری گت بنی اور وہ مثل ہوگئی جیسے کسی اندھے کے سامنے کوئی حسین بے نقاب ہو۔ یہ موقع تفصیل کا طالب تو ہے مگر متحمل نہیں۔ مگر طریق کی تصریح یوں کی جاسکتی ہے۔ کہ حصول ایمان واسلام بطریق احسان۔ احسان کی جو حدیث شریف میں آئی ہے۔ ان تعبدوا الله کانك تراه ۔ وہ عرفان کی جان۔ ایمان کی بنیاد اور اسلام کی روح رواں ہے سارے تصوف اور تفکرات کی بنیاد یہی گہر دانہ حسین اور جواہر پارہ جمیل" کانك تراه "ہے جو محبت ہوجاتی ہے۔ اس کے لئے امکان فنا ہے۔ مگر جو محبت کی جائے اس کی منزل بقا ہے۔ ہوجانے میں اضطرار ہے اور کئے جانے میں اختیار اور اختیار بھی ترقی کرکے صورۃ کیفیت اضطراری اپنے اندر سے ظاہر کرنے لگتا ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ کہ استعداد تو ایک نعمت فطری ہے۔ مگر استعداد صرف بنائے ظہور ہے۔ ظہور بقا اور بقاء ظہور کے لئے۔ یہ انداز جمیل اور یہ اطوار حسین ترتیب ضروری ہے۔

ساتھ ہی ساتھ یہ جان لینا بھی ضروری ہے کہ اہل ایمان کی تعریف خود حضرت حق نے یوں فرمائی ہے۔ والذین آمنوا اشد حبا الله ۔ معلوم ہوا ایمان کی پہچان یہی ہے کہ سب سے زیادہ محبت اس کی ہے۔ جس نے محبت کی جنس گرامی کو مخلوق کے لئے مخلوق کیا اور فطرت بشری کو استعداد محبت سے مزین اور مہذب فرمایا۔ بہ الفاظ دیگر۔ ایمان (تسلیم) اور اسلام (اطاعت) طریق محبت میں پہلا قدم ہے۔ اسی قدم میں فکر و شعور اور ذہنیت کا وہ ماحول بہ تدبیر و کوشش پیدا کیا جاتا ہے۔ جس میں قصد و اختیار سے اس جذبہ محرک کو جسے صرف اپنے قصد و اختیار کا ثمرہ سمجھا جاتا ہے۔ مٹانے کی دھن ہوتی ہے۔ اور ساری طلب اسی کی ہوتی ہے کہ اپنے مقصد و اختیار کی وسعتیں اس درجہ محدود اور فانی ہوجائیں کہ محبوب کی مرضی کے تابع ہوجائیں بہ الفاظ دیگر اپنے کو بھلاکے انہیں کو یاد رکھا جائے اور انھیں اور صرف انھیں کی رضامندی مطلوب ہو۔ یہ وہ مقام ہے جو ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی کیونکہ طلب بہرحال طلب ہی ہے اور طلب ہی رہے گی۔ فرق

صرف کیفیت رسوخ اور احساس حظ التذاذ کا ہے۔ "احسان" وہ اکسیر ہے جس سے یہ شفا مطلوب حاصل ہونے کا امکان قوی ہے۔

عرفی اور رسمی تصوف میں انسان ڈوب جائے تو صرف سطحیات یعنی کیفیات اور احوال پر نظر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی بایں انداز کہ بظاہر کیفیات و احوال ہی کو مقاصد سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ قولاً اگر محققین کے ارشادات سے سمجھا جائے۔ اور حالاً اور حساً حالات و منازل محبت کی معرفت پیدا کی جائے۔ تو یہ نکتہ واضح ہو جائے کہ مقصود وہ اور صرف وہ یعنی ان کی رضا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ صرف وسائل رضا یا نتیجہ ہیں۔ چشم ظاہر کے سامنے موجودات کی ایک غیر محدود وسعت ہے "محب حقیقی" نہ کہ محب لغوی گلستان سے بہار کی بہاروں کے متعلق قیاس آرائیاں کرتا ہے۔ بہ الفاظ حضرت مجذوب ؎

ناچیز ہیں پھر بھی ہیں بڑی چیز مگر ہم　　　دیتے ہیں کسی ہستیٔ مطلق کی خبر ہم

جب گلستان کو آئینۂ بہار دکھایا جائے گا۔ تو اس کی ساری رعنائیاں بھی کسی اور ہی کی رعنائیاں نظر آئیں گی ؎

آتا ہے نظر حسن ہی جاتے ہیں جدھر ہم　　　کیا پھوڑ لیں آنکھیں ہی اب اے حسن نظر ہم

محبت کیا ہے۔ اس کا محل کون ہو سکتا ہے۔ اضطراری طبعی نفسیاتی اور نفسانی تاثرات سے جو تعلق ہوتا ہے۔ یا جو محرکات ظہور میں آتے ہیں وہ محبت یا پر تو محبت نہیں بقول جناب مجذوب ؎

یہ ہوا ثابت بوقت امتحان درد دل　　　درد دل سمجھے تھے جس کو تھا گمان درد دل

کیف محبت کے سراب کو خزینہ آب نہیں مانا جا سکتا۔ بھوک لگتی ہے تو بھوکا کھانے کے پیچھے دوڑتا ہے۔ اس دوڑ اور اس طلب میں فرق کیا ہوا۔ جس میں بجائے لذیذ غذا کے کسی حسین مطلوب کی طلب ہو اور اسی انداز اور بے صبری سے جیسے لذیذ غذا کی ہوتی ہے۔ اس طلب میں فکر ہوتی ہے۔ حصول اور وصول کی اور اس حصول و وصول کی سعی میں وسائل کے حسن و قبح پر نظر نہیں ہوتی۔ پس شرط اول قدم آنست، کہ مجنوں باشی یہ صورت حال صرف گرسنگی اور تشنگی کی قسم کی محبت عام لغوی میں نظر آئے گی۔ ورنہ محبت تام و حقیقی نام ہے۔ ہوش و عقل اور شعور کے ساتھ ترک اختیار ترک وہم اور ترک فکر وصول کا۔ ع　پسر دم جملہ خویش را۔

ذوق شعری فطری اصلی اور سلیم ذوق شعری آن حقیقت کو خوب (اور مزے سے لے کے خوب) سمجھ سکتا ہے۔ کہ تعلقت ہوئی ہے۔ جمال الٰہیہ کے ناز تشریح کے اعتراف و تحمل کے لئے عام اور عرفی محبت کے لئے مقصود محبت؛ مجازی، مادی اور بیکری ہوتا ہے اور فکر اور کوشش ہوتی ہے۔ مقصود و مطلوب کو مفتوح کرنے کی۔ مگر مقصود مل گیا۔ تو روح مردہ ہو جاتی ہے۔ ورنہ امتداد سے کمزور تو بہر حال ضرور ہو جائے گی ناز تشریح کے محرمان اسرار کے یہاں مقصود غیر متناہی اور "آتش عشق بر روز تیز تر گردد" کا عالم ہوتا ہے، یہاں کوشش ہوتی ہے۔ استعمال اختیار حسب رضا محبوب اور موافق و ماتحت مرضی مختار کی مقصود خود کو مفتوح و مغلوب کرتا ہے۔ بایں انداز کہ ترکِ اختیار پہ کاربند ہونا فرض اولیں ہے۔ محبت کے اس ذوق امتیازی کو زبان مجذوب یوں ادا کرتی ہے ؎

اہل نظر نہیں سمجھے تجھے اے سادہ جمال　　　کوئی اس حسن کو پوچھے ہم ادا دانوں سے

سچی بات یہی ہے۔ کہ دقائق ادا تک رسائی صرف ادا دانوں ہی کی ہو سکتی ہے۔ بتائیے مجذوب سے ادا دانوں کے سوا یہ کون کہہ سکتا ہے ؎

محبت، محبت، محبت، محبت　　　بڑا لطف دیتا ہے نام محبت!

محبت کے بدلے محبت ستم ہے　　　نہ لے اف نہ لے انتقام محبت

تصوف ایک نام ہے۔ اصول محبت کے حالات اور حقوق کی ادائگی کی اصلیت (پیدا کر کے) پیدا ہونے کا۔ اس عالم میں زندگی کہتے ہیں۔ بندگی کو۔ اور بندگی اسیرانہ نہیں عاشقانہ، بہ زبان احقر احسن ؎

ان کا سا کچھ ہوئے بغیر ان کا ہو ہم نشیں کیوں

اے مرے عشق فتنہ گر تو بھی نہیں حسین کیوں

ان سے ربط پیدا کرنے اور پیدا ہونے کے لئے کچھ نہ کچھ ان کا سا ہونا ضروری ہے۔ ملکات فاضلہ اسی لئے ودیعت کئے گئے ہیں کہ اخلاق الٰہیہ کے رنگ میں مشہود ہوں۔ اور ان سے حصول ربط کی سعی کرنے میں اس رنگ کا چڑھ جانا حقیقی ہے اور جتنی ہی سعی میں کمی ہوگی اس رنگ میں کمی ہوگی ؎

پا کے فضائے حسن خود ہو نہ گیا حسین کیوں
عشق ہی میں اگر مرے کوئی کمی کہیں نہیں

"طریق احسان" حصول محبت کے لئے راس التدابیر بلکہ واحد تدبیر ہے۔ تصوف کی اصطلاح اختیار کی گئی محض تشریح، تصریح اور توضیح کے لئے فہم کو قریب اور عمل کو اس کی طرف مائل کرنے کے لئے احسان کے ہر رخ ہر کنایہ اور ہر صراحت کی بسیط تفصیل اس طرح کر دی گئی کہ ہر ادا آئینہ ہو جائے۔ بعض چیزیں تدبیر اور علاج کے درجہ میں خارج سے بعد میں ایسی شامل کی گئیں جو ابتدا میں نہ تھیں۔ ان میں خارجیت کے متعلق نافہمی نے بہت سے ذہنی اور من گھڑت گھروندے بنا ڈالے اور بعض لوگوں نے ان محدثات پر اتنا زور دیا اور ان پر دہ وقت گنوایا کہ حاصلاً حقائق ان سے نہیں تو ان کی راہ چلنے والوں کی نظر سے پوشیدہ ہو گئے ہیں۔ بہر صورت، "گوہر اگر در خلاب افتد ہماں نفیس است" گرد آلود ہو جانے سے حسین چہرہ کے حسن میں کوئی نقص نہیں واقع ہوتا۔ حسن ہر آن اور ہر شان حسن ہی ہے اور حسن ہی رہے گا۔ بدعات کے حصار میں اصل دین کی تابانیاں مخفی نہیں رہتیں۔ اسی طرح باوجود زوائد حشویات اور اغلاطیات کے خود دین اور تصوف کے محاسن اپنی جگہ پر قائم ہیں

شعریت یا شعر سخن کا تعلق سلوک سے کیا ہے۔ یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک نکتہ اس سلسلہ میں بالکل بے پردہ سامنے ہے اور وہ یہ ہے کہ شعر میں حدود کی رعایت سے اگر حظوظ کی رعایت کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ الشعراء یتبعھم الغاوٗن کے بعد الا الذین آمنو۔ بھی ہے۔ دوسری چیز ذوق شعری کا محرک اور معین حصول آداب محبت ہوتا ہے۔ جن فطرتوں کو قدرت سے ذوق شعری کی فراوانی کیفاً یا کماً یا کیف و کم دونوں کی بہتات کے ساتھ عطا ہوئی ہے۔ ان میں حاصلی اور ثمراتی درجہ میں محبت کی استعداد ادا دانی اور رمز شناسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اور حسن تدبیر اس دولت بے بہا کو یہی نہیں کہ چار چاند لگا دیئے۔ بلکہ نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے اور جمال و کمال کے سارے محاسن اس پر خود ہی نثار ہونے لگتے ہیں۔ اس راہ میں بے راہ وہی نظر آئیں گے جو سوء تدبیر یا نقص تربیت کے شکنجے میں پڑ گئے۔ یا جنھوں نے آمد یا آورد کے فرق کو محسوس نہ کر کے اپنے امکانات سے زیادہ بلند پروازی شروع کر دی۔ یہ بھی

سمجھ میں آتا ہے کہ اساسی طور پر جس طرح راکب روح کو راہ طے کر کے منزل پر پہنچنے کے لئے مرکب تن کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ذوق شعری بہ الفاظ دیگر امکانات نو استعداد و موسیقی و نغمہ بالکل اسی طرح جیسے آواز و اسطہ سماعت سے ذوق تک پہنچتی ہے۔ نفس اور نفسانیات کو چھیڑ کر روح اور روحانیت کو جنبش میں لاتی ہے۔ بقول سعدیؒ ؎

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

یہاں بھی حضرت کردگار کے دفتر ہونے کے لئے نظر کا ہوشیار ہونا ضروری ہے۔ ورنہ ہر نظر میں وہ بصیرتیں کہاں۔

ایک بار خواجہ مجذوب کے ذکر جمیل کے سلسلہ میں ان کے ایک شناسا اعلیٰ عہدہ دار نے جو تعلیم جدید کے ساتھ ماحول قدیم کے بھی آشنائے لذت ہیں۔ اور یورپ۔ امریکہ اور ممالک عربیہ اور اسلامیہ کی سیاحت بھی کر چکے ہیں۔ راقم الحروف سے یوں اپنی رائے ظاہر کی کہ حضرت اقدس تھانوی قدس سرہ نے مجذوب کو سنبھال لیا۔ اور مرتب و مہذب فرما دیا۔ ورنہ اس شخص کی استعدادیں نہ جانے اسے کس فضائے رقصاں میں گم کر دیتیں۔ غالباً اس طرح کے احساسات نے زبان مجذوب سے یوں حقیقت کو جہاں آشکار کر دیا کہ ؎

مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ میں اک مطرب خوشنوا چاہتا ہوں

ساز کے نغمے ہمیشہ زخمۂ مطرب کے انتظار میں رہتے ہیں۔ مجذوب کا خزینۃ النغمات بصورت ذوق شعری چشم براہ تھانہ بھون کے مربی کے مضراب تربیت کا اگر نغمائیت اور شعریت۔ تربیت میں مقید و محصور نہ کر دی جاتی۔ تو نہ جانے استعداد مجذوب پر کیا کیا بجلیاں گرتیں۔ مجذوب کو خود بھی اس شعلہ فطرتی کا احساس تھا اور اس کے ایک رخ کو یوں فرماتے ہیں۔

نکلتے ہیں نالے بھی منہ سے تو موزوں عبث شاعری چھوڑنا چاہتا ہوں

رحمت کی جو بارش ابر کرم سے ہوتی ہے۔ اگر تالاب حوض اور نہروں میں اس کے پانی کو اکٹھا اور محفوظ نہ کر دیا جائے۔ تو بنجر اور شور زمین میں جذب ہو کے رہ جائے اور بارش رحمت کی نافعیت اور افادیت ظہور میں بھی نہ آسکے۔ اسی طرح بصیرت نہ حسن نظر "حسن ذوق (جس کا ایک پرتو ذوق شعری بھی ہے)

اگر تربیت سے محروم و مہجور رہیں اور بے محل اضاعت کا شکار ہو جائیں۔ اس قسم کی ہر استعداد اور شان کے تمامی امکانات اور میلانات کا "ثمرہ محسوس" ذوق محبت ہے اگر یہی ذوق محبت اگر حیوانات کی طرف جھک جائے تو انسان کو "اس کے جسم و روح کو" اس کے میلانات و رجحانات کو اس کے استعداد و امکان کو۔ اس کے کردار و اطوار کو بہترین نمونہ حیوانیت اور بدترین نظیر بربادی انسانیت بنا دے۔ اور اگر روحانیت یعنی مطلوب بلندی انسانیت کی طرف پرواز کرے تو صاف "اگر باشد ندانم چوں کند" کا مضمون ہوگا۔

آپ جہاں بھی سنیں گے کہ ذوق سماع کا وجود ہے۔ وہاں بنیادی چیز صرف یہی ہے کہ ذوق شعری میلان نغمائیت اور استعداد حسن پسندی کی ضیافت طبع کی جاتی ہے۔ اگر غذا لطیف ہے تو نتائج لطیف ہوں گے اور اگر غذا کثیف ہے تو نتائج بھی کثیف اور دراصل حاصل اس استعداد کا ذوق محبت ہے۔ اور تصوف کی صورت میں اہل ذوق اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور بس جو الجھی ہوئی اور مجمل تفسیر اس بنیادی پس منظر کی ہو سکی۔ جس کے تاثرات نے مجذوب کی شعر نوازی کی صورت اختیار کی وہ سطور بالا میں کی گئی۔ اب ان تصورات فہمی و ذہنی کے ساتھ کلام مجذوب کو دیکھئے تو اس کی حقیقتیں آپ پر آشکار ہوں۔

مفسرین محبت نے آئین محبت کی تدوین کر کے اس کو ایک فن کی حیثیت کو پہنچا دیا اور حقیقت یہی تصوف ہے۔ جو فطرتیں خالق فطرت کے تصور سے دور ہو کر یا اس کے انداز مقبول کی روشنی سے الگ ہو کر اس راہ میں چلیں، وہ کف دود اور مشت غبار ہی کے بے حاصل۔ حاصل تک پہنچ سکیں۔ اور جن کی تربیت طریق الٰہیہ پر ہوئی وہ ترقی کرتی گئیں اور حقائق مقصود سے بہرہ اندوز ہوتی گئیں۔ مجذوب دو لفظوں میں ترجمان محبت تھے اور بس تصوف کے اسرار و غوامض کو اشعار میں ادا کرنا۔ یہی معنی رکھتا ہے کہ محبت کے "ادا دانوں" میں ہیں۔ اور (کسی درجہ میں) قابو یافتہ اور فہیم "ادا دانوں" میں کیونکہ "راہ جمال" کی "شاہراہ جمیل" کے ہر پیچ و خم اور نشیب و فراز سے جانی بوجھی واقفیت رکھتے ہیں۔ اور یہ خوب سمجھتے ہیں: "کہ ہر چہ بردے می رسی بر دے مایست" اسی لئے تو کہتے ہیں ؎

بہت دُور پہنچا ہے مجذوب پھر بھی بہت دور ابھی ہے مقام محبت

قادر الکلامی کا یہ عالم تھا کہ جو بات کہنے کے قابل ان کے نزدیک ہو سکتی تھی۔ اور کہنے پر آ گئے تو اس بے تکلفی اور اس بے ساختہ روانی سے ادا کر جاتے ہیں۔ کہ شاید و باید۔ اور بہر حال حدود سے باہر تو کبھی وہ ہوتے ہی نہیں، صفت تو یہ ہے۔ کہ ظرافت کے میدان میں بھی سنجیدگی اور سبق آموزی پر ہمیشہ نظر رہی اور عموماً ان کے تمامی اثراتِ فکر کا منشا ایک اور صرف ایک اور یہ تھا ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار
بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

ملاحظہ فرمائیے اس شعر میں جذب و سلوک کے فرق اور شیخ کے حسن ترتیب کو کس حسن و خوبی سے اور کس سادہ انداز میں ظاہر کیا ہے ؎

محفل میں تیری سب کے ارمان نکل رہے ہیں
سالک ابل رہے ہیں، مجذوب اچھل رہے ہیں

ذرا اس شعر پر توجہ فرمائیے ؎

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اس شعر کا مزہ تو وہی خوب لوٹ سکتا ہے جس نے خود اسے پڑھتے سنا ہو۔ مگر بہر حال محبت کا معراجِ کمال وحدتِ طلب، وحدتِ رویت، وحدتِ شہود۔ وحدت وجود کیا ہے۔ جو اس میں نہیں پھر تاروں اور مہر کی مثال سے تاروں کا اکتساب نور مہر سے واضح کر کے مہر کے سامنے ان کا ماند بلکہ بے وجود ہو جانا۔ عارف کا مظاہر اور ممکنات کے حجابات اٹھا کر اسی کو جلوہ گر دیکھنا۔ سبحان اللہ ایک شعر ہے ؎

لاکھ اٹھا اب کہیں اٹھتا ہے یہ مجذوب کا سر
سجدہ مچلا ہے تیرے در پہ جبین ناز میں ہے!

جبین کو صاحب ناز اس حسن سے دکھا دینا شاعر محض کا کام نہیں۔ ایک تو سجدہ ہی مقصود عبد و بندگی ہونا پھر اس مقصد کے حصول و مقام پر جبین ساجد اور احساس سجود کا ناز اور تنا قصد مداومت اللہ اللہ

ساری دنیا کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوب
تب کہیں جا کے تیرے دل میں جگہ پائی ہے

ماسوا کو عموماً اور کبر و حب جاہ کو خصوصاً آگ لگائے بغیر منظور و مقبول ہونا ممکن نہیں۔ کیوں نہ مجذوب کے حسنِ ادا کی داد دیجئے۔ دیکھئے ایک معنی کر کے اپنے کلام۔ طرزِ کلام اور بنائے کلام پر بہترین مفسرانہ تبصرہ وہ خود ہی کرتے ہیں ؎

قدرِ مجذوب کی خاصانِ خدا سے پوچھو
شہرہ عام تو اک قسم کی رسوائی ہے

طالب کی معراج کا مقام سجدہ با حضور ہے۔ فرماتے ہیں ؎

تصور عرش پر ہے۔ وقفِ سجدہ ہے جبیں میری
مرا اب پوچھنا کیا، آسمان میرا زمین میری

تصور عرش پر ہے "کانک تراہ" کی تصویر پیش کرتا تو کیا ہے۔ "الا لیعبدون" کی شان وقفِ سجدہ ہے جبیں میری سے ظاہر ہوتی ہے، اور دوسرا مصرعہ "سخر لکم ما فی السموات والارض" کا پرتو ہے۔

"کلامِ مجذوب" ایک دفتر ہے۔ معرفت طریق اور ادا دانی رموز محبت کا کوئی کہاں تک نمونے پیش کرے گا۔

ایک غزل کے چند اشعار بلا انتخاب خاص سن لیجئے اور بس مگر اس مطلع کے بعد ؎

لڑکپن میں ہم عیش کا کھیل کھیلے وہ تتلا کے کہنا لئے لے۔ اللے

حیرت اور حیرت کا اثر اور راہِ عشق میں اسرار و غوامض کے لحاظ سے ہمیشہ مبتدی رہنا کیا خوب واضح کیا ہے۔ طور ہو کر دور ہو کر والی غزل کے چند شعر بے ساختہ یاد پڑ گئے۔ ذرا انہیں بھی دیکھئے ؎

سر دار ہو کر سرِ طور ہو کر تیرے پاس آئے بڑی دور ہو کر

سردار اور سرِ طور میں احوال و کیفیات کی طرف اشارہ ہے۔ اس دقیقہ کے ساتھ کہ احوال و کیفیات مشعل راہ اور نشانِ طریق ہوں تو ہوں خود ان سے بہر صورت بعید ہیں۔ اور ان تک پہونچنا اور کچھ ہے۔ اور احوال و کیفیات اور چیز ہیں ؎

نہ ترساؤ ہر گام پہ دور ہو کر کوئی ہار بیٹھے نہ مجبور ہو کر

راہِ محبت میں یوں بھی ہوتا ہے۔ اور اس لئے حسن و طلب کی ضرور داد دیجئے جو "نہ ترساؤ" میں ہے۔ اپنی مجبوریوں کا اظہار کوئی ہار بیٹھے۔ ہیں صاف صاف ہے۔ اور دونوں مصرعوں میں اس کو بالکل کھول دیا کہ وصول صرف ان کے کرم پر منحصر ہے۔ تو بقول مجذوب "وہی چاہتے ہیں میں کیا چاہتا ہوں"

تمام حدودِ عشق کی تصویر کیا خوب کھینچی ہے۔ اس شعر ہیں ؎

حدیں عشق کی کو رہے ہیں وہ قائم کبھی پاس ہو کر کبھی دُور ہو کر

اور پھر تسلی کا پہلو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ درمیان میں ایک مطلع اور یاد آگیا ؎

چمکنے لگا سر بسر نور ہو کر میں جل جاتے والا نہیں طور ہو کر

سمٰوٰت و ارض کے ساتھ جبل نے بھی حمل امانت سے انکار کر دیا تھا لہٰذا بمقابلہ طور انسان کا تفوق ظاہر ہے۔ دوسرا اشارہ جو اس میں ہے وہ یہ کہ تجلیات و انوار کا ورود جب ہوگا تو ان کی برکات سے مصفی و مزین اور مہذب ہو جائے گا اور جہاں یہ صورت ظاہر نہ ہو سکے۔ سمجھ لینا چاہئے کہ تجلیات نہیں صرف گمان ہے ؎

تن یاسمین پہ لباس مصفّیٰ وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر

شیخ کی تعریف میں اس شعر کو سمجھئے یا نعت میں مانیے ہر جگہ صادق۔ یاسمین میں رنگینی نہیں ہوتی۔ سفید سادگی ہوتی ہے۔ اس سے کنایہ ہے۔ جلوہ بے رنگ کی طرف اور نورٌ علیٰ نور تو اللہ نورُ السمٰوٰتِ والارض کے بعد خود ارشاد الٰہی ہے۔

یہ کس کی محبت میں مرنے چلا ہوں چلی آرہی ہے قضا حور ہو کر

موت مومن کا تحفہ ہے۔ اور مومن کی صفت اشد حباً للہ ہے۔ خواجہ حافظ نے بھی فرمایا ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم راحت جاں طلبم وز پئے جاناں بردم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تا درِ میکدہ شاداں و غزل خواں بردم

حکایت لذیذ ہے اور اندیشہ ہے کہ کہیں طبیعت اسے دراز تر نہ کر دے لہٰذا اس شعر پر گذارش

ختم کی جاتی ہے۔

جب عشق میں ہو حسن خدا داد کا عالم
تب آئے نظر حسن خدا داد کا عالم

مجذوبیت خواجہ مجذوب ہے جاذب
یا عشق میں ہے حسن خدا داد کا عالم

احسن یہ خدا داد بصیرت نے دکھایا
مجذوب میں ہے حسن خداداد کا عالم

بطور ضمیمہ یہ امر بھی واضح کر دینا ہے کہ معاصرین میں بھی حضرت مجذوب کی حیثیت شاعرانہ کا پایہ بلند تھا اور مشاہیر تو ان کے کلام سے بے حد لذت اندوز ہوا کرتے تھے۔ جناب ہرگوبند دیال صاحب نشر پریسیڈنٹ ایسوی ایشن اردو کے ذریعہ سے جو حضرت مجذوب کے طالب علمی کے رفقاء میں ہیں۔ استاد مسلم الثبوت جناب سیماب اکبرآبادی مرحوم کا وہ قطعہ تاریخ جو انہوں نے جناب مجذوب کی وفات پر لکھا تھا۔ احقر تک پہونچا هذا ؎

آں عزیز احسن امیر و فقیر
سید و صوفی و عزیز قلوب

بست و ہفتم زماہ شعبان وسعت
مہر شد صبح پنج شنبہ غروب

شرنے یافت در ریاض جناں
کہ زا سر معلیٰ بدہ منسوب

شاعر خوش بیان و شیوہ کلام
شعر او بود نغمہ مرغوب

نشتر از ہجر او جراحت یافت
ہمچو یوسف ز صدمۂ یعقوب

سال رحلت بگفتم اے سیماب
صاحب کشف سالک مجذوب

۱۰۱۰ ، ۴۰۰ ، ۱۱۱ ، ۵۱۰ء

۱۳۶۳ھ

اس قطعہ میں شیوہ کلام عمومی حیثیت سے اور نغمۂ مرغوب بہ رعایت اسم تاریخی جناب مجذوب اور نیز

ؔ حضرت بابا نجم احسن صاحب از کشکول مجذوب

بہ لحاظ معنویت دونوں ٹکڑے خاص طور پر توجہ کے قابل ہیں اور مصرعہ تاریخ بھی خوب ہے۔ ۱۷ اگست ۱۹۴۴ء کو حضرت مجذوب جنت الفردوس کو راہی ہوئے۔ بستر علالت پر سے ۱۵ اگست ۱۹۴۴ء کو جو محبت نامہ انھوں نے اس ناچیز کو رقم فرمایا۔ بدست نفیس وہ ۱۸ اگست ۱۹۴۴ء کو موصول ہوا۔ ان کے صف قدسیاں میں شامل ہونے کے ایک دن بعد۔ اس نامۂ محبت کے چند الفاظ پر اس ژولیدہ نگاری کو ختم کیا جاتا ہے۔ بہرحال

گو میں رہا رہین ستم ہائے روزگار لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

دعائے صحت فرمائیں بظاہر انشاء اللہ کوئی خاص تردد کی بات معلوم نہیں ہوتی۔

" والغیب عند اللہ والخیر ما اراد اللہ

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ بڑے پایہ کے قادر کلام اور مسلم شعراء میں سے ہیں۔ ان کے ہزاروں اشعار ادبی دنیا کے بڑے بڑے ماہرین سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ مگر ان کی مجذوبیت کا یہ رنگ رہا کہ ان کا دیوان ان کی حیات میں تو کیا آج تک مرتب نہ ہوا۔ ان سے جب کوئی کہتا کہ آپ اپنے اشعار اور غزلیں نظر ثانی کر کے دیدیجئے تاکہ مرتب ہو جائے تو فرمادیتے تھے کہ میاں کبھی دیوانوں کا بھی دیوان مرتب ہوا ہے۔" (۲)

حضرت تھانوی قدس سرہ نے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار کے بارہ میں فرمایا تھا کہ "خواجہ صاحب تصوف کے دقائع وغوامض کو اپنے اشعار میں ادا کرتے ہیں۔"

حضرت تھانوی فرماتے تھے کہ "خواجہ صاحب کے تمام اشعار ان کا حال ہیں۔ (۳)

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے خواجہ صاحب نے ایک مرتبہ کہا کہ میرا ارادہ ہے کہ شعر کہنے سے توبہ کرلوں۔ اور میں نے اس کے متعلق فال دیکھی تو یہ شعر نکلا تھا۔

چند گوئی نظم و نثر راز فاش
خواجہ یک روز امتحان کن گنگ باش

---

(۱) قدر مجذوب۔ (۲) حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

(۳) بروایت مولانا عرفان صاحب۔

اس پر حضرت تھانویؒ نے فرمایا اچھا ہے یہ قطعہ الامداد کے آخر میں لکھ دیں اچھا ہے دوسروں کو فائدہ ہوگا مگر کہیں آپ یہ فن نہ بھول جائیں۔ یہ شاعری بھی ایک کمال ہے جس کا بھولنا ٹھیک نہیں"۔

ایک مرتبہ فرمایا۔ خواجہ صاحب کا یہ شعر اسقدر پسند ہے کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا تو انعام دیتا۔ جب پڑھتا ہوں تو کم از کم تین مرتبہ پڑھتا ہوں۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس شعر کے متعلق فرماتے تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ خواجہ صاحب کے اس شعر کو سونے کے پانی سے لکھوا دوں۔

بہر غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں
رہ گذر دنیا ہے یہ بستی نہیں
جائے عیش و عشرت و مستی نہیں (۱)

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شعر پڑھنے کا ایک خاص انداز تھا۔ ان کے حرکات و انداز سے شعر کا اثر یقیناً دو چند ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ جگر مرادآبادی نے مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعہ کلام کے بارہ میں کہا دیکھئے مولانا مجذوب کا یہ مجموعہ کیسا بے جان نظر آرہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ مولانا کے حرکات اور ان کی بے چینی کو جب تک شامل نہ کیا جائے۔ صحیح معنوں میں ان سے لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔" (۲)

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے کلام سے سامعین پر ایک جادو سا کر دیتے تھے۔ حکیم سید محمد ابراہیم رزمی صاحب تحریر فرماتے ہیں" ایک دفعہ ہم لوگ بلت پور کے سٹیشن پر حضرت مجذوب صاحب کو

---

(۱) بہ روایت مولانا محمد عرفان صاحب۔

(۲) یاد مجذوب معین الدین احمد۔

الوداع کہنے کے لئے جمع تھے۔ احباب کا اچھا خاصا مجمع تھا۔ حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مخصوص والہانہ انداز میں اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اس وقت سکھ رجمنٹ کی ایک گاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ ان لوگوں نے حضرت خواجہ صاحب کو اشعار پڑھتے سنا تو آپ کے گرد جمع ہو گئے اور حضرت کے اثر آفریں اور کیف پرور کلام سے اس درجہ متاثر بلکہ بے خود ہوئے کہ گاڑی کی بار بار سیٹی کے باوجود عالم بے خودی میں حضرت کے گرد حلقہ بنائے آپ کا کلام سنتے رہے۔ اور ناچار ان کی خاطر گاڑی رکی اور تقریباً ایک گھنٹہ تاخیر سے روانہ ہوئی اس سے مجذوب صاحب کی اثر آفرینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے"۔ (۱)

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں "جالندھر قیام کے بعد ہم امرتسر جا رہے تھے۔ اسٹیشن پر جا کر معلوم ہوا کہ گاڑی لیٹ ہے۔ حضرت خواجہ صاحب حضرت تھانوی کے ملفوظات جو ان کو کافی یاد تھے حسب عادت سنانے میں مصروف تھے کہ اسٹیشن ماسٹر آ گیا جو ہندو تھا۔ اس نے چند منٹ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کلام سن کر کہا کہ گاڑی لیٹ ہے آپ حضرات کے لئے میں ویٹنگ روم کھول دیتا ہوں۔ اس میں بیٹھ جائیں۔ چنانچہ ہم سب لوگ ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے اور خواجہ صاحب کا سلسلہ کلام جاری رہا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس ہندو سٹیشن ماسٹر کے سامنے پیغام بیداری کے چند بند بھی پڑھے جو غالباً یہ تھے۔

بتوں کا منتہائے آرزو بس دال روٹی ہے
یہاں مد نظر حق ہے نہ روٹی ہے نہ بوٹی ہے
ہمارا میل کیا اس قوم سے یہ قوم کھوٹی ہے
کہ مذہب اس کا چوٹی ہے تمدن اک لنگوٹی ہے

اس پر ہندو اسٹیشن ماسٹر نے کہا۔

"یہ شخص یہاں رہتا ہو گا وہاں تو آگ لگا دیتا ہو گا اور یہ بھی کہا کہ جی تو چاہتا ہے کہ ملازمت ترک کر کے اس کے ساتھ رہوں۔ (۲)

(۱) بہ روایت حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب۔

(۲) بہ روایت مولانا عبدالمجید صاحب۔

خواجہ صاحب کے لئے بڑی سے بڑی مشکل بحر میں کہنا اور پھر فی البدیہ کچھ مشکل کام نہ تھا۔ ایک مرتبہ دہلی میں مشاعرہ ہوا۔ اس مشاعرہ کے متعلق حضرت خواجہ صاحب خود فرماتے ہیں "میرا لڑکا بیمار ہوا میں دہلی بغرض علاج گیا ہوا تھا کہ دہلی کے شعراء نے آکر کہا کہ ہم دہلی کے تمام شاعر آپ کی زیارت کرنی چاہتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں اس وقت کوئی خوشی کے موقع پر نہیں آیا ہوں کچھ سناؤں گا نہیں نہ نیا نہ پرانا۔ اول تو میں نے بہت ٹالنے کی کوشش کی لیکن جب انہوں نے بہت مجبور کیا تو منظور کر لیا۔ میں نے کہا جہاں جائے کی جاوے وہاں مسجد کا پتہ کر لیا جائے کہ مسجد کہاں ہے اور اس میں عصر کا وقت کیا ہے اور گھڑی مسجد کی گھڑی سے ملائی جائے تاکہ نماز عصر با جماعت ادا ہو سکے۔ میرا کچھ سنانے کا ارادہ نہ تھا اور ان سے وعدہ بھی لے لیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر خاموشی خاموشی میں کچھ ایسا ہوا کہ میں نے فی البدیہ کہنا شروع کر دیا۔

جو چپ بیٹھوں تو اک کوہ گراں معلوم ہوتا ہوں

جو لب کھولوں تو دریائے رواں معلوم ہوتا ہوں

جو ہوں دراصل صورت سے کہاں معلوم ہوتا ہوں

بہار بے خزاں ہوں گو خزاں معلوم ہوتا ہوں

اس وقت دہلی کے شعراء نے کہا کہ فی البدیہ فرمانا اور اتنی بڑی اور سخت بحر میں بڑا مشکل کام ہے اور اس وقت ہندوستان میں تغزل میں آپ کا ثانی نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ بھائی قصیدہ وغیرہ میں کے لئے شاید کچھ تھوڑا ٹھیک ہو غزل میں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" لیکن پھر بھی سب نے یہی کہا کہ حضرت اس وقت تغزل میں آپ کا ثانی ہندوستان میں نہیں ہے۔ (۲)

حضرت سائیں طور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بزرگ تھے جو آخر میں حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ملتان میں مقیم رہے اور ملتان ہی میں انتقال فرمایا وہ پہلے خانقاہ امدادیہ میں بھی مقیم رہے تھے۔ ان کے لئے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا۔

خانقاہ اشرفی میں طور شاہ
رہتے رہتے ہو گئے ہیں نور شاہ (۳)

۱۔ فراق مجذوب سید سلیمان ندویؒ۔ (۲) بہ روایت مولانا عبدالمجید صاحب۔ (۳) بہ روایت مولانا عبدالمجید صاحب

خانیوال کا ایک لڑکا جو میٹرک پاس کر چکا تھا۔ اس کا والد اس کو کالج میں داخل کروانا چاہتا تھا اور اس کا استاد اس کو عربی پڑھنے پر مجبور کر رہا تھا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا گیا چونکہ استاد صاحب کا حضرت خواجہ صاحب سے تعلق تھا۔ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں یہ لکھا۔

خوب دنیا کما مگر بھائی

دین کو پاس پہ تو مقدم رکھ

دینے لگتا ہے یہ چراغ دھواں

لَو کو اس کی ذرا تو مدھم رکھ (۱)

ایک دفعہ اوڈی میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکان پر احباب جمع تھے، حکیم سید محمد ابراہیم رزمی صاحب سے فرمایا کہ پڑھو۔ حکیم صاحب نے شعر پڑھا۔

جیتے ہیں اب نہ مرتے ہیں اپنی خوشی سے ہم

یہ جانتے تو دل نہ لگاتے کسی سے ہم

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کس نے کہا تھا کہ دل لگاؤ۔ حکیم صاحب نے کہا کہ بغیر کہے لگ گیا۔ فرمایا۔ مصرعہ بدل دوں گا چنانچہ تھوڑی دیر گنگنانے کے بعد فرمایا۔ یوں پڑھو۔

جیتے ہیں اب نہ مرتے ہیں اپنی خوشی سے ہم

اچھا ہوا کہ چھوٹ گئے فکر ہی سے ہم (۲)

حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب تحریر فرماتے ہیں " ہم لوگ للت پور میں تھے۔ ہمارے یارانِ خاص لطافت علی ہما اور مجید الظفر صاحب حضرت مجذوب صاحب سے ملنے اوڈی جارہے تھے۔ اس ناچیز کو بھی دعوت سفر دی گئی۔ حضرت مولانا ثامن علی صاحب بھی ہمسفر تھے۔ میں نے حضرت ثامن علی صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا سالک مل گیا ہے اب مجذوب کی کیا ضرورت ہے تاہم احباب کے اصرار پر ارادہ سفر ہو گیا گاڑی

---

(۱) بہ روایت مولانا عبدالمجید صاحب۔

(۲) حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب

رات کے تین بجے اور ئی سٹیشن پہنچی۔ اس ناچیز نے اپنی شیروانی گرد سفر سے بچانے کے لئے گاڑی میں الٹی کر کے لٹکا دی تھی جب گاڑی دیار مجذوب میں داخل ہوئی تو حضرت مجذوب کے جذب کا اثر ملاحظہ ہو کہ شیروانی الٹی ہی پہن لی۔ گاڑی کے اسٹیشن پر رکتے ہی حضرت مجذوب صاحب ہمارے کمرے میں داخل ہوئے احباب نے تبلایا کہ حکیم صاحب بھی ساتھ آئے ہیں۔ میرا ہاتھ پکڑا اور یہ اشعار فرمائے۔

رہبر جو ڈھونڈتا ہے دیار حبیب کا
ہرگز نہ دیکھ فرق امیر و غریب کا
مجذوب کا رفیق ہو سالک کا ساتھ چھوڑ
آ اس طرف کہ جذب ہے رستہ قریب کا (۱)

شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ خواجہ صاحب کا اور ہمارا لکھنؤ میں ساتھ ہوا۔ شہر کے اندر وائسرائے کی آمد تھی۔ استقبال کے لئے راستے کاغذی پھولوں سے سجائے گئے تھے۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس خوشحالی اور سجاوٹ کو دیکھ کر مجھ سے فرمایا کہ دنیا کے اس عارضی وفانی نقش ونگار پر اس وقت ایک شعر وارد ہوا ہے۔

رنگ رلیوں پہ زمانے کی نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ انداز بہار آئی ہے (۲)

حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلیفہ لطف رسول صاحب بعض مرتبہ شعر پر اس قدر شدید کیفیت طاری ہو جاتی تھی کہ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے تھے اور بے اختیار چیخنے لگتے تھے اور بسمل کی طرح تڑپنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت پر منصوری پہاڑ پر تشریف لے گئے وہ چونکہ بہت نحیف و نازک مزاج تھے۔ چڑھائی زیادہ چڑھنی پڑی۔ اس لئے سفر سے بے حد تعب ہوا۔ عین تکان کی حالت میں جبکہ سخت چڑھائی کے موقعہ پر سخت پریشان تھے اور ناگواری میں حضرت

---

(۱) حکیم سید ابراہیم رزقی صاحب۔

(۲) شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری۔ معرفت الٰہیہ۔ کراچی ۱۹۲ ص

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ سے شکایت فرما رہے تھے تو خواجہ صاحب نے یہ شعر پڑھا۔

یہ شکوہ بے وفائی کا یہ رونا کج ادائی کا

سزا ہے دل لگانے کی مزہ ہے آشنائی کا

بس یہ شعر سننا تھا کہ تھکان و تعب سب بھول گئے جوش میں آکر ایک زور سے چیخ ماری اور وجد میں آکر رقص کرنے لگے۔ (۱)

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف ایک قادر الکلام شاعر تھے بلکہ جب شعر و سخن کا سلسلہ شروع کرتے تو سلسلہ اتنا طویل ہو جاتا تھا کہ بعض اوقات صبح کی اذانیں ہو جاتی تھیں لیکن مجلس کا یہ حال ہوتا تھا کہ نہ تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے چہرے پر تھکن کے آثار ہیں اور سامعین میں پہلی جیسی لگن اور شوق کے ساتھ خواجہ صاحب کو سننے میں محو ہیں۔

رضا انصاری صاحب تحریر فرماتے ہیں "مجذوب صاحب انسپکٹر آف سکولز ہو کر لکھنؤ میں متعین ہوئے تو ان کا قیام وکٹوریہ سٹریٹ پر ہوا۔ ۱۹۳۰ء یا ۱۹۳۱ء سے پہلے پہل ان کی شاعری اور والہانہ زندگی کا ذکر اپنے چچا مولانا صبغت اللہ صاحب کی زبانی سنا تھا جو ایک دوسرے عزیز کو کہہ رہے تھے "سڑک پر ایک ہجوم دیکھ کر میں اس طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک صاحب کھڑے جھوم جھوم کر اور رقص کر کے گا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر چونکے اور بولے کہ آیئے آیئے آپ حضرات اہل علم ہیں۔ میں ان کے قریب چلا گیا۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ تک کبھی اس غزل کے کبھی اس غزل کے اشعار بلا لحاظ ترتیب سناتے رہے۔"

ایک مشاعرہ کا حال تحریر فرماتے ہیں "مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی۔ ۸ بجے رات سے مجذوب صاحب نے سنانا شروع کیا نہ وہ سنانے سے تھکے اور نہ سننے والے تھکے۔ فجر کی نماز کے وقت بادل نخواستہ محفل برخاست ہوئی۔ محفل برخاست ہونے کا مطلب پڑھنے والے جو سمجھے ہیں وہ یقیناً نہیں ہے۔ مجذوب صاحب کی محفل نرالی شان سے برخاست ہوتی تھی۔ مثلاً فجر کی اذان ہوئی سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے کہ نماز کی تیاری کریں۔ مجذوب صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے مگر گنگناتے ہوئے

اور شعر سناتے ہوئے جوتا پہن رہے ہیں اور شعر سنا رہے ہیں۔ گھر سے نکل رہے ہیں اور گھوم گھوم کر شعر سنا رہے ہیں۔ کچھ بڑے اور باقی لڑکے ان کی مشایعت کو تھوڑی دیر گئے۔ مجذوب صاحب شعر سناتے جا رہے ہیں اور اگر زور روں پر ہیں تو راستے میں کھڑے ہو جائیں گے اور سناتے رہیں گے۔ مشایعت کرنے والوں کو ان کے اشعار کشاں کشاں ان کے گھر تک پہنچا دیں گے۔ جب تک گھر کا دروازہ کھلے شعر سناتے جائیں گے، یہاں تک کہ گھڑی دیکھ کر ایک دفعہ زور سے استغفر اللہ کہیں گے۔ گویا نماز کا وقت تنگ ہوتا جا رہا ہے، اور جلدی جلدی اپنے مکان کے زینے سے چڑھ کر جا رہے ہیں۔ اس طرح محفل برخاست ہوتی تھی ایک دو بار کی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ۔

ایک دفعہ لگاتار ۲۴ گھنٹے کی نشست ہوئی جس میں نماز چائے کھانا کے علاوہ کوئی وقفہ نہیں ہوا۔ اس کے بعد بھی یہی محسوس ہوا کہ نہ سنانے والا تھکا اور نہ داستان مکمل ہوئی۔" (۱)

شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر فرماتے ہیں۔

"تقریباً ۱۹۳۵ء کا ذکر ہے کہ راقم الحروف کسی ضرورت سے لکھنؤ گیا۔ ایک دن مخدومی قطب میاں سے ملنے فرنگی محل جانا ہوا۔ اس وقت ان کے پاس ایک فرشتہ صورت اور مجذوب صفت بزرگ بڑے والہانہ انداز سے زمزمہ سنجی میں مصروف تھے۔ دو چار شعر ہی سنے ہوں گے کہ کلام کی خوبی نے اپنی جانب متوجہ کر لیا اور تا آنکہ ختم مجلس کے وقت دل کلام کی تاثیر سے معمور اور زبان اس کے اعتراف پر مجبور تھی لیکن اس مختصر صحبت سے ذوق کو تسکین نہ ہوئی بلکہ آتش شوق اور بھڑک اٹھی۔ اتفاق سے اس شب کو کسی تقریب کے سلسلہ میں قطب میاں کی جانب سے دعوت تھی۔ موصوف نے مجھے بھی مدعو کیا۔ اس دعوت میں خواجہ صاحب اور دوسرے عمائد شہر بھی شریک تھے۔ کھانے سے فراغت کے بعد محل سرا میں خواجہ صاحب کا جام گردش میں آیا اور نو دس بجے سے لے کر صبح صادق تک برابر موصوف کی شعر خوانی کا سلسلہ جاری رہا۔ (۲)

---

(۱) تحریر رضا انصاری صاحب۔

(۲) تحریر شاہ معین الدین احمد ندوی۔

حضرت قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"خواجہ صاحب بے نظیر شاعر تھے مگر ان کی شاعری معرفت پر ہوتی تھی اور ان کے اشعار ان کے احوال ہوتے تھے۔ اس لئے ان کا کلام سے بالخصوص جبکہ وہ خود پڑھتے تھے۔ قلوب پر خاص اثر پڑتا تھا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی متاثر ہو کر سناتے تھے اور اس میں محو اور مستغرق ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ دیوبند تشریف لائے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے یہاں قیام ہوا۔ مجھ سے ملنے دار العلوم میں تشریف لائے۔ چند منٹ کے بعد ان پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوئی اور وہ اشعار سنانے کے ذیل میں نمایاں ہونے لگی۔ دفتر کے جو افراد وہاں بیٹھے تھے وہ بھی ان میں مستغرق ہو گئے اور جو آتا گیا۔ محو ہو کر بیٹھتا گیا۔ صبح آٹھ بجے سے یہ مجلس شروع ہوئی۔ بارہ بج گئے۔ نہ انہیں اپنی خبر رہی نہ ہی ہم لوگوں کو اپنی خبر۔ پیرست دیر مست دنگی بازار مست کا سا قصہ ہو گیا۔ مفتی صاحب کے یہاں سے آدمی بلانے کے لئے آگیا فرمایا بیٹھ جاؤ چلتے ہیں اور اشعار کا سلسلہ جاری رہا۔ جب ایک بج گیا تو دوسرا آدمی بلانے کے لئے آیا۔ تب اٹھے۔ مفتی صاحب کے یہاں پہنچ کر دستر خوان بچھ گیا۔ اشعار کا بقیہ سلسلہ وہاں جاری رہا ظہر کی نماز کا وقت آگیا اٹھ کھڑے ہوئے۔ بعد نماز دستر خوان بچھا۔ اور اندازہ ہوا کہ اب پھر سلسلہ جاری ہو جائے گا تو مجبور ہو کر ان کو کھانے پر بٹھایا گیا تب کہیں ڈھائی تین بجے کھانا شروع ہوا۔ (۱)

ایک بار حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھانہ بھون میں تھے۔ حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ نے فرمایا گو میں بوڑھا ہو گیا ہوں مگر پیرانہ سالی کا ضعف محسوس نہیں ہوتا۔ خواجہ صاحب نے عرض کی حضرت اگر اجازت ہو تو شعر پیش کروں۔ حضرت نے اجازت دے دی تو خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر پڑھا۔

پیری میں بھی جو سوجھ رہی یہ مستیاں
دیکھا ہے ناز میں کسی مست شباب کو

---

(۱) بہ روایت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب

(۲) بہ روایت ماسٹر منظور احمد صاحب مجاز صحبت حضرت حکیم الامت قدس سرہ۔

ایک مرتبہ حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم سید ابراہیم رزمی صاحب کو دیوانہ لکھا اس پر انہوں نے یہ اشعار لکھ کر خواجہ صاحب کو بھیجے ۔

میں ہوں خیال ہوش سے بیگانہ آجکل
کہتے ہو تم بھی خود مجھے دیوانہ آج کل
میں پختہ کار عشق ہوں اور یہ ثبوت ہے
ہوں تم سے ہوش مند کا دیوانہ آجکل
بدمستیوں کا رنگ نہ رزمی سے پوچھئے
ٹکرا رہا ہے عرش سے پیمانہ آجکل

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر آج کل کی ردیف میں وہ اشعار کہے جو آج بھی کشکول مجذوب میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔ اور حضرت خواجہ صاحب کی قادر الکلامی اور اعلیٰ درجہ کی شعریت کی دلیل ہیں ۔

حضرت کے پاس ایک صاحب کا خط آیا ۔ اس میں اپنی نمازوں کی بے قاعدگی کا ذکر تھا حضرت مجذوب صاحب نے جواب میں یہ اشعار ارقام فرمائے ۔

نہ چت کر سکے نفس کے پہلواں کو!
تو یوں ہاتھ پاؤں بھی ڈھیلے نہ ڈالے
ارے اس سے تو کشتی ہے عمر بھر کی
کبھی تو دبا لے کبھی وہ دبا لے [۱]

حضرت خواجہ صاحب کے ایک بھانجے کو خان بہادری کا خطاب عطا ہوا ۔ اس زمانہ میں حکومت کی طرف سے خان بہادر کا خطاب عطا کیا جانا ایک بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا ۔ چنانچہ انہوں نے ایک بڑی مجلس کا اہتمام کیا ۔ اس میں ان کے بھانجے ایک اعلیٰ لباس میں بڑا سا طرہ لگائے خواجہ صاحب کے سامنے

---

(۱) بہ روایت حضرت مولانا ابراہیم رزمی صاحب ۔

سے گزرے۔ حضرت خواجہ صاحب نے ازراہ خوش طبعی فی البدیہہ فرمایا

کیا شان دکھاتے ہو تم اے خان بہادر

تم خان بہادر ہو ہم ایمان بہادر (۱)

ایک مرتبہ خواجہ صاحب کا ایک ہندو رئیس دوست ملنے آیا باتوں باتوں میں یہ تذکرہ چل نکلا کہ یہ تو ہندوؤں کی فراخ دلی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اس برصغیر میں زندہ رہ سکے۔ وہ ہندو رئیس کہنے لگا کہ اگر ہندو چاہتے تو مسلمانوں کو ختم کر سکتے تھے۔ اس پر خواجہ صاحب نے فی البدیہہ فرمایا۔

میرا نقش ہستی نہیں مٹنے والا

بتوں کے مٹائے یہ مٹتا نہیں ہے

اسے میٹنے میں وہ مٹ جائیں گے خود

کہ یہ نقش سجدہ ہے قشقہ نہیں ہے

آپ کے ایک نوجوان صاحبزادہ کا انتقال ہو گیا۔ یہ لڑکا نہایت ہی نیک اور صالح تھا اس نوجوان لڑکے کی موت فرماتے ہیں ۔

یہ عالم عیش و عشرت کا یہ حالت کیف و مستی کی

بلند اپنا تخیل کر یہ سب باتیں ہیں پستی کی

جہاں دراصل ویرانہ ہے گو صورت ہے بستی کی

بس اتنی سی حقیقت ہے فریب خواب ہستی کی

کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہو جائے

---

(۱) بہ روایت مولانا محمد عرفان صاحب۔

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا آخری سفر

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کے وصال کے بعد ایک جگہ جم کر نہیں بیٹھے۔ اپنے پیر بھائیوں سے مل مل کر غم ہلکا کرنے اور جو آگ اپنے دل میں لگی تھی۔ اس کو دوسروں کے دلوں میں بھڑکا دینے کا ایک جذبہ تھا۔ جو حضرت خواجہ صاحبؒ کو سیماب وار ایک جگہ سے دوسری جگہ اور دوسری سے تیسری جگہ بھیجتا رہتا، پہلے تھانہ بھون تشریف لائے۔ جہینہ بھر رہے تو خواجہ صاحبؒ کی آمد کی خبر سن کر پیر بھائیوں کا ایسا اجتماع یہاں ہوا کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے حیات کا زمانہ تازہ ہوگیا۔ پھر یہاں سے خواجہ صاحب اعظم گڑھ حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کے ہاں تشریف لائے تو حضرت خواجہ صاحب کے ہمراہ کوئی دس بارہ خلفائے اشرفیہ جن میں حضرت شاہ عبدالغنی پھولپوریؒ بھی شامل تھے اعظم گڑھ آئے، تین دن یہ روحانی اجتماع یہاں رہا۔ پھر یہاں سے خواجہ صاحب اپنے وطن کے عزم سے چلے تو دیوبند ٹھہرتے ہوئے حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحبؒ کے حسب خواہش امرتسر تشریف لے گئے اور جالندھر حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ کے ہاں بھی مختصر قیام فرمایا۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ صاحب کے آخری سفر کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"۲۹ جنوری ۱۹۴۳ء کو حضرت خواجہ صاحب نے اپنے رفقاء خاص کی ملاقات کے لئے سفر کیا دیوبند تشریف لائے۔ پھر جالندھر حضرت مولانا خیر محمد صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ وہاں سے

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس امرتسر پہنچے۔ اس تمام سفر میں احقر (حضرت مولانا مفتی صاحب دامت برکاتہم) ساتھ رہا۔ خواجہ صاحب کو حق تعالےٰ نے ایک خاص شان محبوبیت عطا فرمائی تھی۔ جہاں جس جگہ بیٹھ جاتے تھے اپنے پرائے واقف لوگوں کا اجتماع ہو جاتا تھا اور خواجہ صاحب عشق الٰہی اور توحید کے مضامین پر مشتمل اشعار سناتے رہتے تھے۔ خواجہ صاحب پر ایک مستی کی کیفیت ہوتی اور اس کا تمام حاضرین پر اثر ہوتا تھا۔

دیو بند کے قیام میں ایک روز دارالعلوم کے دارالمشورہ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی ملاقات کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مجلس جم گئی۔ دارالعلوم کے مدرسین طلباء کا خاصا مجمع ہو گیا۔ خواجہ صاحب اپنے والہانہ طرز میں اشعار پڑھ رہے تھے اور مجمع بہت تھا۔ کئی گھنٹے میں بمشکل مجلس برخاست ہوئی۔

اس سفر میں مولانا شبیر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم خانقاہ امدادیہ بھی ساتھ تھے۔ انہوں نے تھانہ بھون کی مخصوص روایات کے تحت یہ محسوس کیا کہ کئی گھنٹے تک جو دارالعلوم کا پنکھا ہماری وجہ سے چلتا رہا۔ یہ کوئی دارالعلوم کا کام تو نہیں تھا۔ اس لئے اس کا خرچہ ہمیں ادا کرنا چاہیئے۔ ایک روپیہ مہتمم صاحب کے حوالہ کیا کہ یہ دارالعلوم میں جمع کر دیا جائے۔

دیو بند سے امرتسر تک کا یہ سفر بڑا پرلطف سفر تھا۔ اس کے بعد ایسا سفر کبھی نصیب نہیں ہوا۔ جالندھر سے امرتسر جانے کے لئے اسٹیشن پر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ایک ڈیڑھ گھنٹہ لیٹ ہے۔ خواجہ صاحب نے اپنا مشغلہ شروع کر دیا۔ تمام سٹیشن کا عملہ اور مسافر ہندو مسلمان سب جمع ہو گئے۔ سب پر ایک مستی طاری تھی۔ خواجہ صاحب کی یہ مجلس غافل انسان کو اللہ تعالیٰ سے وابستہ کرنے کے لئے بڑی اکسیر تھی۔

امرتسر پہنچے تو یہاں حضرت مولانا مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی کے خلیفہ خاص اور فدائی تھے۔ حضرت کی مجلس کے مخصوص احباب کے ورود کو انہوں نے ایک عید سعید قرار دیا۔ خلاف عادت پرتکلف مہمانی کا انتظام کیا اور سب سے کہہ دیا کہ آپ لوگوں کو اس پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ یہ

ہماری عید کے دن ہیں اور عید کے موقع پر اس طرح کے توسع کی اجازت ہے۔ بڑی پرلطف مجلس رہی۔ آموں کا موسم تھا مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے عمدہ آم مہیا کئے اور سب سے پوچھا کہ کب کھائیں گے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مشورہ سے عشاء کے بعد کا وقت طے پایا۔

اتفاقاً اس روز خواجہ صاحب کو کچھ حرارت تھی۔ ایک حکیم صاحب بھی شریک مجلس رہا کرتے تھے انہوں نے آم کھانے سے منع کیا۔ ان کو آم کھانے پر اصرار رہا۔ ہم سب روک رہے تھے اور وہ چھین جھپٹ کر رہے تھے اور ہر آم پر تازہ شعر کہے جاتے تھے۔ اس تفریح کے ساتھ عشاء کے بعد کی مجلس ختم ہوئی یہ کس کو خبر تھی کہ خواجہ صاحب کے ساتھ یہی آخری مجلس تھی۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے خواجہ صاحب کا بخار بڑھنا شروع ہوا۔ آخر شب میں آنکھ کھلی تو خواجہ صاحب کے کراہنے کی آواز کان میں پڑی۔ پاس گیا تو معلوم ہوا کہ سینہ میں درد ہے۔ فوری تدبیر سکائی کی گئی۔ بخار بھی خاصا بڑھ گیا تھا صبح حکیم صاحب بلائے گئے۔ انہوں نے نمونیہ تشخیص کیا۔ خواجہ صاحب کو جب نمونیہ کا احساس ہوا تو اپنی بیماری اور درد بھول گئے۔ آخرت کی فکر سب پر غالب آگئی اور گریہ و زاری شروع کیا۔ (۱)

حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ایک خلیفہ حضرت ماسٹر شریف صاحب رحمت اللہ علیہ نے حضرت اقدس قدس سرہ کی وفات کے بعد حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ سے اپنا تعلق قائم فرمایا اور اس سلسلہ میں ایک خط لکھا۔ اس کے جواب میں حضرت خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا۔ میں تو یہ کام ضرور انجام دوں گا۔ بعد میں حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جب آخری سفر کے سلسلہ میں امرتسر تشریف لے گئے۔ حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمت اللہ علیہ نے مسجد نور میں ایک کمرے کی چھت کے اوپر حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لئے بجلی کا پنکھا لگوایا تھا۔ بعد نماز عصر ایک دن مجلس میں حضرت نے فرمایا " ایک صاحب کا خط آیا ہے۔ تعلیم کی درخواست کی تھی میں نے لکھا " اس ضابطہ کی کیا حاجت ہے میں تو یوں بھی مال نہ مان تیرا میزبان ضرور ہوں۔ پوچھنے پر بلکہ بے پوچھے بھی جو الٹا سیدھا سمجھ میں آتا ہے عرض کرتا ہی رہتا ہوں اور کرتا ہی رہوں گا۔

تحریر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

نقل ارشادات مرشد میکنم
آنچہ مردم میکنند بوزینہ ہم
اصل کی برکت سے لیکن کیا عجب
نقل سے بھی ہو رہی فیض اتم

بار بار یہ اشعار پڑھ رہے تھے اور وجد میں آئے ہوئے تھے اور سب کو وجد میں لائے ہوئے تھے۔(۱)

حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ کے ایک خادم مولوی بشیر محمد صاحب حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے آخری سفر کے بارہ میں تحریر فرماتے ہیں "آخری ملاقات جالندھر میں نصیب ہوئی جب حضرت رحمۃ اللہ علیہ خیر المدارس جالندھر میں حضرت تھانوی کے وصال کے بعد تشریف فرما ہوئے۔ احقر بھی زیارت کے لئے ہوشیار پور سے جالندھر حاضر ہوا۔ شیخ کی جدائی میں بے کلی دیکھی نہیں جاتی تھی۔ سراپا درد بن رہے تھے۔ ہر وقت ان کا ذکر اور ہر وقت ان کا دھیان اور یہ شعر ورد زبان۔

نقل ارشادات مرشد میکنم
آنچہ مردم میکنند بوزینہ ہم

پھر وہاں سے امرتسر تشریف لے گئے اور مسجد کی ڈیوڑھی پر بالاخانے میں تشریف فرما ہوئے جو مرثیہ حضرت خواجہ صاحب نے حضرت تھانوی قدس سرہ کے انتقال پر لکھا تھا۔ وہ مولانا ظہور الحسن صاحب کی زبانی سن رہے تھے جس میں وہ سوز تھا کہ حاضرین زار و قطار رو رہے تھے۔ پھر فرمایا یہ جگہ بڑی بابرکت ہے یہاں تو ہفتہ عشرہ ٹھہر کر اللہ اللہ کرنے کو جی چاہتا ہے۔" (۲)

امرتسر میں قیام کے دوران جب آپ بیمار ہو گئے تو مفتی محمد حسن صاحبؒ کے لڑکے مولانا عبید اللہ صاحب سے فرمایا کہ لطف تو اللہ کے تعلق اور اس کی یاد اور دین میں ہے میں اگرچہ نہ عالم ہوں نہ کچھ مگر پھر بھی لوگ میری اس قدر رعایت محض اس لئے کرتے ہیں کہ ان کو شبہ ہے کہ میں دیندار ہوں۔" (۳)

(۱) بہ روایت حضرت مولانا محمد شریف صاحب دامت برکاتہم۔
(۲) بہ روایت حضرت مولانا بشیر محمد صاحب۔ (۳) القول العزیز۔ ص ۹۸۔

امرتسر میں جب خواجہ صاحب بہت بیمار ہوئے تو حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب نے ان کی سہولت کے لئے اپنے عزیز کو ان کے ہمراہ اوریٔ تک ساتھ بھیجا۔ امرتسر سے وطن تک گاڑی میں بیماری کی حالت کے باوجود پانچ نمازیں باجماعت ادا کیں۔ اس سفر میں یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت خواجہ صاحب کے ایک دوست نے ان کو کہا تھا کہ وہ انبالہ سے کھانے کا انتظام کردیں گے لیکن اتفاق سے وہ ایسا نہ کر سکے۔ چنانچہ رات کے کھانے ہی سے گزر کیا گیا۔ راستہ میں فرمایا کہ "اگر مولوی ابرار الحق صاحب کو ذرا خیال آجائے تو صبح ناشتہ لے آئیں۔ مولانا ابرار الحق صاحب حقی نے خواجہ صاحب کو پہلے سے مطلع کیا تھا کہ وہ ناشتہ لے کر آئیں گے چنانچہ صبح کو مولانا ابرار الحق صاحب مع ناشتہ کے ہردوئی سٹیشن پر موجود تھے۔ مولانا حقی صاحب نے خواجہ صاحب سے فرمایا کہ ناشتہ ایسے برتنوں میں بند ہے کہ ٹھنڈا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب تک گاڑی سٹیشن پر کھڑی ہے۔ اس وقت تک مجلس جاری رہے۔ گاڑی چلنے کے بعد گاڑی ہی میں ناشتہ کرلیں۔ جب گاڑی روانہ ہوئی اور خواجہ صاحب ناشتہ سے فارغ ہوئے تو فرمایا خدا معاف کرے کہیں اس پر مواخذہ نہ ہو جائے کہ طمع کیوں کی تھی ۔۔۔ "

خواجہ صاحب کے وطن پہنچ کر حضرت خواجہ صاحب کے ساتھ جو حضرت تھانوی کے خادم گئے تھے۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے گھر یاد آرہا ہے۔ مجھے واپسی کی اجازت دی جائے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے تین ٹوکریوں میں پیڑے بندھوا کر تھانہ بھون اور امرتسر کے لئے دیئے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دیا۔

چند پیڑے ہیں تکلف برطرف
گر قبول افتد زہے عز و شرف

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک رفیق ڈاکٹر منظور الحق صاحب مزید تحریر فرماتے ہیں۔

" سفر آخرت فرمانے سے پہلے کوئی دو تین ماہ قبل کی بات ہے کہ بہ ارادہ حاضری و چندے قیام خانقاہ تھانہ بھون روانگی ہوئی۔ اس عارضی سفر میں حضرت مولانا سید ابرار الحق صاحب حقی مولوی حبیب اللہ صاحب و مولوی عبدالصمد صاحب کانپوری مجازین حضرت تھانوی کے علاوہ ایک جوان العمر مولوی یوسف صاحب جو حضرت مجذوب سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے۔ نیز اس احقر کو مشرف معیت حاصل تھا

راستہ میں حضرت مجذوب نے فرمایا کہ پہلے یہاں سے سہارن پور پہنچ کر سیدھے منصوری پہاڑ پر تفریحاً پہنچا جاوے۔ پھر وہاں سے سیدھے خانقاہ تھانہ بھون پہنچ کر حجرہ نشین ہوا جائے جس قدر بھی زائد سے زائد ہو سکے قیام کر کے وہاں کے انوار و برکات سے کر خانہ نشین ہونا چاہیئے پھر کہیں نہ جانا چاہیئے یہ گویا اس سفر منصوری کے بعد آخرت کے لئے پیشین گوئی کی تھی مگر اس وقت کون سمجھ سکتا تھا۔ بہر نوع حضرت مجذوب مع رفقاء کے براہ سہارن پور و دہرہ دون منصوری پہاڑ پر پہنچ گئے۔ راستہ میں حضرت مجذوب نے فرمایا کہ منصوری آزادی کی جگہ ہے۔ آزاد بے پردہ مستورات بھی نظر آئیں گی۔ اس لئے میں کچھ نعرے تجویز کرتا ہوں۔ اور اپنے لئے فرمایا کہ میں نظر پہ نظر ہوں گا۔ سب کی نظر میں دیکھوں گا۔ منصوری پہنچ کر وہاں کے شلالا ور جھرنا کے نظارہ کی تجویز ہوئی یہ قافلہ اپنے امیر کے نعرہ ہائے مجوزہ کی پابندی کرتے ہوئے کیمٹی خان جھرنا تک پہنچا ہی تھا۔ سب ہمراہی نظر بر قدم تھے۔ یکبارگی حضرت مجذوب کی انتہائی غیض و غضب سے بھری ہوئی آواز سب کے کانوں میں پڑی کہ اس سے قبل نہیں پڑی تھی۔ نکل جاؤ کالا منہ کر دو جاؤ یہاں سے بے شرم نالائق میں تمہاری وجہ سے گناہ میں مبتلا نہیں ہوں گا۔ اس قسم کے الفاظ فرما رہے تھے ہم سب لوگ حیران تھے کہ یا اللہ یہ کیا ہو گیا۔ کس پر ڈانٹ پڑ رہی ہے۔

ہم نے ہیں محبت کی آنکھیں دیکھیں
جانیں کیا چشم غضب ناک کو ہم

مولوی یوسف صاحب ہمراہی کی بھی یہ آواز کان میں پڑی بے شک قصور ہوا توبہ کرتا ہوں آئندہ ایسا کبھی نہ ہو گا۔ کبھی نگاہ نہ اٹھے گی۔ خدا کے واسطے اس مرتبہ معاف کر دیں۔ جب ذرا سکوت ہوا حضرت خواجہ صاحب اس جگہ سے کہیں ہٹے ہم لوگ مولوی یوسف صاحب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس جلال و عتاب کا سبب دریافت کر رہے تھے۔ مولوی صاحب جواب دے رہے تھے کہ چند یوریین لیڈیز نیم برہنہ جھرنا کے قریب پانی سے کھیل رہی تھیں۔ میری نظر ان کی طرف اٹھ گئی تھی۔ حضرت خواجہ صاحب نظر بر نظر تھے اس حرکت کو دیکھ لیا تھا۔ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ یکبارگی پہاڑ کی کافی بلندی سے السلام علیکم کی آواز سنائی دی۔ سب نے نظر اٹھا کر دیکھا تو حضرت مجذوب صاحب اس بلندی پر نظر آئے۔ احقر نے اس جگہ تک

پہنچنے کی ہمت کی۔ ٹھہر ٹھہر کے قدم مضبوط کر کے۔ آہستہ آہستہ خدا خدا کر کے اس جگہ کے قریب تک پہنچا ہی تھا کہ جس جگہ پر حضرت خواجہ صاحب نظر پڑے تھے پھر السلام علیکم کی دوسری آواز اس جگہ سے پہاڑ کی بلند ترین چوٹی سے کان میں پڑی۔ اب احقر میں اتنی بھی سکت اور ہمت نہ تھی کہ سر اٹھا کر بھی اوپر دیکھ سکے احقر نے اسی جگہ سے نیچے کی طرف مراجعت کی۔ ابھی احقر نیچے نہیں اتر سکا تھا ہر سطح زمین سے حضرت مجذوب کی السلام علیکم کی آواز کان میں سنائی دی۔ آخر بمشکل تمام نیچے آیا۔ پھر یہ قافلہ منصوری کی آبادی کی طرف چلا جو ۹-۷ میل ہو گا۔ پہاڑ کے چڑھاؤ اتار سے جب کوئی ساتھی تھکتا نظر آتا۔ حضرت مجذوب برجستہ مناظر قدرت کے مطابق اشعار سنا دیتے۔ جسم و جان میں تازگی پیدا ہو جاتی۔ یہ اشعار بھی پڑھے گئے۔

کہا ہم اونٹ پر بیٹھیں کہا ہاں اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے کہا کوہان تو ہو گا
کہا ہم نوح سے مل لیں کہا ہاں نوح سے مل لو
کہا طوفان کا ڈر ہے کہا طوفان تو ہو گا

مقصد یہ تھا کہ اگر پہاڑ پر چڑھنے اترنے کا تحمل نہیں تھا تو پھر آئے ہی کیوں تھے۔ غرض کہ اس انداز سے آبادی کے ایک ہوٹل میں پہنچے۔ مالک ہوٹل نے نہ جانے کس طرح پہچان کر خواجہ صاحب کی نظم مسٹر ملا کی نوک جھونک کے چند اشعار پڑھ دیئے۔ یہ نظم حضرت خواجہ صاحب کی مستورات کی بے پردگی پر تصنیف شدہ تھی۔ پھر کیا تھا مجذوب صاحب کے لئے اس قدر چھیڑ کافی تھی۔ خود پڑھنا شروع فرما دیا۔ ایک طرف چائے کا دور دوسری طرف شاعری کا دور۔ عصر کی نماز کا وقت قریب آیا۔ مجذوب صاحب یکبارگی چونکے حساب دریافت فرمایا۔ مالک ہوٹل نے حساب لینے سے گریز کیا۔ لیکن مجذوب صاحب نے غالباً دس روپے کا نوٹ زبردستی چائے کی میز پر رکھا اور تیز قدمی کے ساتھ مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ نماز سے فراغت کے بعد فرمایا کہ اب یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں۔ فوراً خانقاہ تھانہ بھون پہنچنے کا ارادہ کیا۔ وہاں سے چل کر سہارنپور پہنچے اور وہاں سے تھانہ بھون تشریف لائے۔ رفقاء چار چار روز قیام کے بعد واپس آ گئے۔ مجذوب صاحب وہیں مقیم رہے۔ چند روز وہاں قیام کے بعد اپنے پیر بھائی حضرت مولانا محمد حسن صاحب امرتسری کی ملاقات

کے لئے امرتسر تشریف لے گئے۔ وہیں سے مرض الموت کا آغاز ہوا۔ (۱)

آخری سفر کے دوران قیام امرتسر کے بارہ میں مولانا سید سباح الدین کاکاخیل صاحب ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں "مولانا عبدالقدوس سے معلوم ہوا کہ حضرت خواجہ صاحب حضرت مفتی صاحب کے یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں اور مسجد نور میں مقیم ہیں فیصلہ ہوا کہ ہم وہاں جاکر ان کی زیارت سے سعادت اندوز ہوں۔ چنانچہ عصر کے بعد ہم دونوں مسجد نور گئے۔ غالباً مسجد کے مشرقی جانب بالائی منزل پر ایک برآمدہ نما کمرہ تھا جہاں یہ سارے حضرات تشریف فرما تھے۔ وہاں جاکر دیکھا کہ خواجہ صاحب اکیلے ایک چارپائی پر تشریف فرما ہیں اور حضرت مفتی صاحب، مولانا صوفی عبداللہ چند دوسرے علماء اور عمائدین شہر نیچے فرش پر بیٹھے ہیں۔ اس وقت خواجہ صاحب پر ایک جذب و مستی کی حالت تھی۔ لَے کے ساتھ اپنے اشعار سنا رہے تھے اور سب ہمہ تن گوش ان کے ارشادات سن رہے تھے۔ ہم دونوں بھی مؤدب ایک کونے میں بیٹھ گئے اور ان اشعار اور ان کی تشریحات سے محظوظ ہونے لگے۔ اچانک خواجہ صاحب نے فرمایا کہ او ہو میں کتنا بے ادب ہوں۔ یہ بڑے بڑے علماء اور بزرگ تو نیچے بیٹھے ہیں اور میں اوپر چارپائی پر ہوں اور یک دم نیچے اتر کر فرش پر بیٹھ گئے حضرت مفتی صاحب نے اور دیگر حضرات نے یہ اصرار شدید کہا۔ نہیں حضرت کوئی بات نہیں۔ ہم میں سے کسی کو محسوس نہیں ہوتا۔ آپ مہمان ہیں' بیمار ہیں لیکن فرمایا نہیں جب تک اس کا خیال نہیں رہا کہ میں اوپر ہوں آپ حضرات نیچے ہیں تو اس وقت تو میرا بیٹھنا بھی جائز تھا اور خلاف ادب بھی نہیں تھا۔ اور جب مجھے محسوس ہوگیا تو اب میرا اوپر بیٹھنا جائز نہیں۔ اب یہ بے ادبی ہوگی۔ چنانچہ ان حضرات کے اصرار کے باوجود نیچے بیٹھ گئے۔ (۲)

حضرت خواجہ صاحب کے ایک عزیز ڈاکٹر جبار روئی ہسپتال کے مشہور ڈاکٹروں میں تھے اور حضرت خواجہ صاحب کے معالج رہے تھے۔ ڈاکٹر منظور احمد موجی صاحب سے ملاقات پر انہوں نے فرمایا کہ انتقال فرمانے سے چند گھنٹے پہلے میں نے بہ اصرار ایک انجکشن لگایا۔ حضرت خواجہ صاحب نے فوراً پانی طلب فرمایا۔

---

(۱) بہ روایت مکرمی ڈاکٹر منظور احمد صاحب موجی۔

(۲) بہ روایت حضرت مولانا سید سباح الدین کاکاخیل صاحب۔

اور انجکشن کی جگہ لگے ہوئے ٹنکچر آئیڈین کو دھونا اور اس جگہ کو پاک کرنا شروع کیا۔ پاک کرنے کے بعد مجھ سے انگریزی میں فرمایا I am going اور آنکھیں بند کر کے لیٹ گئے اور خاموشی اختیار کی پھر کوئی بات نہ کی۔ متوجہ الی اللہ رہے تھوڑی دیر کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کر کے واصل بحق ہو گئی انا للہ و انا الیہ راجعون (۱)

وفات

۱۹ جولائی کو امرتسر میں بخار ہوا اور سینہ میں درد ہوا۔ اول یونانی پھر ڈاکٹری علاج شروع ہوا حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حق تیمار داری ادا کر دیا۔ غرض ہر مرض میں اور ضعف میں تخفیف ہوئی۔ افاقہ کلی نہ تھا۔ چنانچہ ۸ راگست ۱۹۴۴ء کو خواجہ صاحب اپنے وطن اورئی پہنچ گئے۔ کچھ راستہ کا تکان کچھ مرض کا اثر تو پہلے سے موجود ہی تھا۔ اورئی پہنچ کر عود کر آیا اور سینہ کا درد بھی بڑھ گیا۔ وہاں بھی علاج ہوتا رہا۔ بالآخر ۱۰ راگست ۱۹۴۴ء کو صبح آٹھ بجے چمنستانِ اشرفی کا یہ بلبل ہزار داستان اس دار فانی سے رخصت ہو کر وہاں پہنچ گیا جہاں کچھ عرصہ پہلے اس کا محبوب گل سرسبد گلستانِ چشتیہ (حضرت تھانوی قدس سرہ) زینت بخش ہو چکا تھا۔ رحمہما اللہ تعالیٰ رحمۃً واسعۃً۔

---

(۱) خاتمہ السوانح۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

معاصرین کی نظر میں

خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے معاصرین کی نگاہوں میں کیا مقام رکھتے تھے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ "خواجہ صاحب کے اشعار میں عجب مستی ہے۔"

حضرت سید صاحب نے فرمایا "ہاں وہ پی کر مست ہیں۔ اور ہم بے پیئے ہی مست ہیں۔"

ایک شخص نے علامہ ممدوح رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا "پچھلے دنوں قلب میں سوز کی ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ مستی کی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور عشقیہ شعر پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔" اس کے جواب میں حضرت سید صاحب نے فرمایا "یہ کیفیت مستحسن و محمود ہے۔ ذکر جہری یا عشقیہ اشعار پڑھنے کو دل چاہے تو پڑھ لیں۔ خواجہ صاحب کے اشعار اس کے لئے مفید ہیں۔" (۱)

حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک صاحب کو حضرت خواجہ صاحب کی کتاب "نغیر غیب" کا نسخہ دیا اور فرمایا کہ۔

"بندہ کے نزدیک یہ کروڑوں روپے سے زیادہ قیمت کا ہے۔" (۲)

---

(۱) مولانا محمد اشرف۔ سلوک سلیمانی۔ لاہور ۱۹۶۹ء۔ ص ۱۵۴

(۲) بہ روایت مولانا محمد اشرف صاحب اسلامیہ کالج پشاور

مولانا عبدالسلام صاحب ایک واقعہ تحریر فرماتے ہیں "ایک دفعہ عجیب اتفاق ہوا کہ بعد نماز فجر مدرسہ نیلا گنبد لاہور کی درسگاہ میں ہم لوگ درس قرآن کے لئے حضرت مفتی صاحب کے انتظار میں بیٹھے تھے کہ حضرت والا بڑے ہی کیف و مستی میں کچھ گنگناتے ہوئے تشریف لائے اور مجلس میں بیٹھنے کے بعد بھی ایک مصرعہ دیر تک گنگناتے رہے تمام مجلس کیف و مستی میں ڈوب گئی۔ مصرعہ یہ تھا۔

بے تیرے دل کیا ہے بس اک خول ہے

بہت دیر کے بعد دوسرا مصرعہ ارشاد فرمایا۔

بے خبر کشتی یہ ڈانوا ڈول ہے

اس کے بعد اس شعر کی تشریح فرمائی اور مجلس دعا پر ختم ہوگئی۔ اس دن کا درس یہی تھا۔ (۱)

حضرت حکیم الامتؒ کے مجاز صحبت حضرت نجم احسن صاحب اپنے تاثرات ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں" اپنے حلقے میں جہاں کہیں خواجہ صاحب ہوتے تو بس وہی وہ ہوتے تھے۔ حضرت اقدس سرہ کے اجل سے اجل اور قدیم سے قدیم خلفاءؒ کے گروہ میں بھی خواجہ صاحب کی شخصیت تھی جو انہیں کے الفاظ میں یوں ظاہر ہوتی تھی کہ ؎

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

علم تقویٰ مصلحت کی شان میں کسی کی کچھ نہیں کہا جا سکتا مگر موثریت ان کی خصوصی صفت تھی حضرت رحمۃ اللہ علیہ ان کو عموماً "ہمارے خواجہ صاحب" کہا کرتے تھے۔ حضرت فرماتے تھے کہ خواجہ صاحب کا کلام تشریح کے ساتھ شائع ہو تو اہل سلوک و طریقت اور اہل دل کے لئے بہت مفید ہو۔ خود مجھے اپنے دو شعر ان کی یاد میں آگئے۔ مجذوبیت خواجہ مجذوب ہے جاذب

اس جذب میں ہے حسن خدا داد کا عالم

---

(۱) بہ روایت مولانا عبدالسلام صاحب لائلپوری۔

احسن یہ خدا داد بصیرت نے بتایا

مجذوب میں ہے جذب خدا داد کا عالم

مجلس شعرا میں مشاعروں میں خواجہ صاحب پہنچ گئے تو سب شمعیں گویا بجھ جاتی تھیں۔ (۱)

حضرت علامہ سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں "ان کی جان پہچان کی پہلی ملاقات نواب سید حسن علی مرحوم (بھوپالی) کے ہاں ان کے مکان بھوپال ہاؤس لکھنؤ میں ہوئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بزرگ خواجہ خضر کی صورت، دراز قد، گورا رنگ، لمبی سفید داڑھی، گول میرٹھی ٹوپی پہنے اور پرانے زمانے کی اچکن، پرانے ماڈل کی گاڑی چلاتے ہوئے آئے اور سامنے موٹر روک کر اترے۔ سب نے سروقد تعظیم کی آیئے خواجہ صاحب آیئے خواجہ صاحب، دل نے کہا یہ ضرور خواجہ عزیز الحسن غوری مجذوب ہیں۔ اس حقیر کا بھی تعارف ہوا۔ لطف فرمایا۔

اس کے بعد جب قسمت نے خواجہ صاحب سے خواجہ تاشی کی نسبت کی سعادت بخشی تو تعارف نے ملاقات، ملاقات نے ان کے ساتھ عقیدت اور عقیدت نے محبت کی شان پیدا کی۔ (۲)

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب رحمت اللہ علیہ خواجہ صاحب کے متعلق اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں "حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ اہل دل کی نظر میں عارف کامل تھے جن پر عشق و محبت کا بہت غلبہ تھا۔ فنافی الشیخ کا درجہ حضرت حکیم الامت کے خلفاء میں ان ہی کا خاص حصہ تھا خسرو بارگاہ اشرفیہ مشہور ہیں جیسے امیر خسرو حضرت سلطان نظام الدین کے خدام میں سے ہیں شاعری کے ساتھ فنافی الشیخ تھے یہی حال خواجہ صاحب کا تھا شاعر بھی تھے فنافی الشیخ بھی۔

مجھے خواجہ صاحب سے اور ان کو مجھ سے خاص تعلق تھا ایک بار میں نے عرض کیا کہ خواجہ صاحب وحدۃ الوجود پر کچھ اشعار نظم کر دیجیے فوراً فرمایا۔

آجا مری آنکھوں میں سما جا مرے دل میں

---

(۱) مکتوب گرامی بابا نجم احسن صاحب

(۲) یادِ رفتگان، ص ۳۰۲

پھر اس کو پوری غزل بنا کر پیش فرمایا جو ان کے دیوان میں غالباً چھپ گئی ہے۔ ایک دفعہ میں رنگون سے کلکتہ اور کلکتہ سے تھانہ بھون جا رہا تھا۔ ریل گاڑی لکھنؤ سے گزری اور آدھ گھنٹہ وہاں ٹھہری۔ دیکھتا کیا ہوں کہ خواجہ صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ یاد نہیں میں نے اس ٹرین سے گزرنے کی اطلاع ان کو کر دی تھی یا کسی اور ذریعہ سے معلوم ہوا۔ بڑے تپاک سے ملے بغل گیر ہوئے اور جب تک ریل ٹھہری رہی اپنا کلام منظوم سناتے رہے۔ جب گاڑی چھوٹنے لگی تو گاڑی سے نیچے اترے اور یہ شعر پڑھا۔

یہ ہوتا ہے رخصت غلام محبت

سلام محبت، سلام محبت

۱۳۵۰ھ میں جب میرا مکان تھانہ بھون میں تعمیر ہو کر مکمل ہو گیا تو میں نے اس کی تاریخ امداد ظفر منزل نکالی۔ خواجہ صاحب نے اسی وقت نظم لکھ ڈالی۔

اللہ کا ہے انعام امداد ظفر منزل — ہے باعث صد آرام امداد ظفر منزل

رکھتی ہے عنایت سے اللہ تعالیٰ کی — ہر خوبی استحکام امداد ظفر منزل

مجذوب یہ مسکن ہے کس عارف کا — پُر نور جو ہے تا بام امداد ظفر منزل

اس کے ہیں مکین حضرت مولانا ظفر احمد — ہے ہر لائق صد اکرام امداد ظفر منزل

یا رب ہو بفیضان مولانا ظفر احمد — وجہ ظفر اسلام امداد ظفر منزل

مولانا نے جب سوچی تاریخ بنا مجذوبؔ — یہ نام معلوم ہوا الہام امداد ظفر منزل

ایک دفعہ خواجہ صاحب نے ایک نظم سنائی جس کا ایک شعر تھا۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی

اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

حکیم الامت نے فرمایا تھا کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپیہ ہوتا تو اس شعر پر انعام دیتا یہ شعر حضرت حکیم الامت کو پسند تو تھا ہی مگر معلوم ہوتا ہے کہ عالم غیب میں بھی مقبول ہوا ہے۔ ایک بار میں سو رہا تھا خواب میں دل پر حق تعالیٰ کی خاص تجلی ہوئی تو اس وقت بے ساختہ میرے منہ سے

یہی شعر نکلا۔ (۱)

حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں " حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں اتنا ہی واقف ہوں کہ نہایت بابرکت صاحب موعظہ صاحب بصیرت ولی تھے۔ حضرت تھانوی قدس سرہ کے عشاق اور معتمد علیہ افراد میں سے تھے۔ میرے ساتھ بے انتہا شفقت و مدارۃ سے پیش آتے تھے۔ نام کے مجذوب نہیں بلکہ حقیقتاً دل کے مجذوب تھے۔ بے نظیر شاعر مگر ان کی شاعری معرفت سے پُر ہوتی تھی اور ان کے اشعار ان کے احوال ہوتے تھے۔ شعروں کا سلسلہ ایک مرتبہ شروع ہوا تو پھر گھنٹوں جاری رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان پر استغراق تھا اور اس کا ظہور بہ زبان اشعار ہوتا تھا۔ نہ ان کو اپنی خبر رہتی تھی نہ دوسروں کی پر ان کے قلب کی کیفیات تھیں۔ بہر حال بابرکت بابصیرت بامعرفت فرد تھے اور ان کی مجلس سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔ ایک بار بنارس جاتے ہوئے ریل میں میرا اور ان کا لکھنؤ سے ساتھ ہو گیا۔ وہ کلکتہ میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے جا رہے تھے۔ لکھنؤ سے بنارس تک کی نشست ادبی بن گئی۔ دوسرے مسافر بھی ان کے پاس آکر جمع ہو گئے۔ بہر حال ان میں ایک جاذبیت تھی محض مجذوب ہی نہیں جاذب بھی تھے۔ ورنہ مجذوبوں میں عموماً کشش نہیں ہوتی بلکہ دفع کا مضمون ہوتا ہے لیکن ان کی مجذوبیت سے بھی اندازہ ہوا کہ بے خودی محض کی نہ تھی بلکہ اس میں خودی بمعنی محویت تھی لیکن خود فراموشی نہ تھی " (۲)

حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری نے فرمایا " خواجہ صاحب کا مقام بہت بلند تھا مگر حضرت رحمۃ اللہ علیہ (تھانوی قدس سرہ) کے سامنے وہ ایسے چھپ گئے تھے جیسے آفتاب کے آگے ماہتاب

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں " مجدد الملۃ حکیم الامت سیدی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے مجددانہ کارنامے اور لافانی یادگاریں بہت ہیں۔ ان میں سے ایک سلسلہ آپ کے خلفاء کا ہے جنہوں نے پورے ملک کے گوشہ گوشہ میں اس مجدد وقت کی تعلیمات کو

---

(۱) مکتوب گرامی حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی۔

(۲) مکتوب گرامی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب۔

عام کیا اور اصلاح خلق کی بڑی خدمت انجام دی۔

خواجہ عزیز الحسن مجذوب اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک بلند پایہ شاعر مجذوب تخلص شگفتہ مزاج باغ و بہار انسان ہونے کے ساتھ مکمل درویش اور صوفی متقی پرہیز گار بزرگ تھے۔ دربار اشرفی میں ان کے ساتھ ایک طویل رفاقت رہی اور جب ان کا تصور آتا ہے تو ایک عجیب سا منظر سامنے آ جاتا ہے۔"

خواجہ صاحب شاعر مزاج آدمی اکثر مصروف گفت گو رہتے تھے اور تھانہ بھون جس کام کے لئے آتے اس کا تقاضا کچھ اور کہ۔

لب ببند و گوش بند و چشم ببند

حضرت قدس سرہ نے ان کے لئے ایک چلہ سکوت کی تجویز فرمائی کہ چالیس روز کسی سے زبانی گفتگو نہ کریں ضروری بات پرچہ پر لکھ دیں۔ خواجہ صاحب کے لئے یہ بڑی سخت قید اور آزمائش تھی مگر شیخ کا حکم تھا تعمیل کرنے پر مجبور۔ اسی طرح وقت گزار رہے تھے۔ ایک چلہ پورا ہونے کے بعد خواجہ صاحب احباب سے ایسے ملے جیسے کوئی گرمی کے زمانے کا روزہ افطار کر کے پانی شربت وغیرہ میں مشغول ہوتا ہے حضرت نے اس واقعہ کا ذکر ایک روز مجلس میں فرمایا کہ جب میں نے خواجہ صاحب کو چلہ سکوت کرایا تو میں کہا کرتا تھا کہ جس دن یہ چلہ ختم ہوگا خواجہ صاحب اتنا بولیں گے کہ چالیس دن کے سکوت کی کسر نکال لیں گے مگر میں جانتا ہوں کہ پھر بھی اس سے کم گوئی کا ملکہ پیدا ہو جائے گا۔ حق تعالیٰ نے حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت قدس سرہ سے اکتساب فیض کی بڑی طویل مدت عطا فرمائی اور حضرت کی خصوصی توجہات کا مرکز رہے۔

اصلاح نفس کے سلسلہ میں خاصے مجاہدات سے ان کو گزارا گیا۔ اسی کو مجذوب صاحب نے اپنے اشعار میں کہا ہے

ہئے یہ ملی نہیں ہے یوں	قلب و جگر ہوئے ہیں خوں
کیوں میں کسی کو مفت دوں	مئے میری مفت کی نہیں

اِسی کا نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو تقویٰ و طہارت میں شیخ کا نمونہ بنا دیا تھا۔ خواجہ صاحب نے فرمایا ہے۔ ؎

مجھے دیکھ آئینہ یار ہوں میں
جلا کردۂ دستِ دلدار ہوں میں

حضرت حکیم الامت کو در حقیقت اللہ تعالیٰ نے حکیم الامت بنایا تھا جو اسلام اور مسلمانوں میں پھیلنے والی بیماریوں کو نبض سے پہچان کر ان کے انسداد کی فکر کرتے تھے۔ اس سلسلہ کی ایک وصیت وہ ہے کہ حضرت نے اپنے وصیت نامہ میں پہلے لکھ کر شائع کر دی تھی کہ میرے بعد کوئی میری سوانح نہ لکھے کیونکہ تجربہ یہ ہوا تھا کہ بعد کے لوگ طرح طرح کے مبالغے کرتے ہیں اور بے سر و پا قصے عقیدت مندی کے مد میں شائع کر دیتے ہیں مگر جب بہت سے حضرات نے خود حضرت سے عرض کیا کہ بزرگوں کی سوانح حیات سے مسلمانوں کو بہت سے اپنے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اس کو روکنا ایک بڑی چیز سے رکاوٹ ہوگی تو حضرت نے یہ تجویز فرمایا کہ میں صرف اس صورت میں اجازت دے سکتا ہوں کہ میرے سامنے کوئی صاحب لکھیں اور مجھے دکھلا دیں۔ اس کام کے لئے سب کی نظر خواجہ صاحب پر گئی اور یہ طے ہوا کہ وہ طویل رخصت لے کر تھانہ بھون میں قیام کریں۔ اس تجویز کے تحت خواجہ صاحب رخصت لے کر آ گئے۔ حضرت جانتے تھے کہ مجذوب صاحب کی یہ کوشش ہوگی کہ تمام حالات و واقعات اور ملفوظات کا استیعاب کر کے اس سمویں وہ کتاب بہت طویل بھی ہو جائے اور رخصت کے ایام میں پوری بھی نہیں ہوگی۔ اس لئے یہ ہدایت فرما دی کہ اہم عنوانات کو پہلے مختصر لکھ لیا جائے تاکہ رخصت کے اندر یہ کام پورا ہو جائے مگر مجذوب صاحب کے جذبات کس طرح قابو میں آتے۔ وہی ہوا۔ رخصت ختم ہونے کے قریب آ گئی اور کام بہت رہ گیا۔ ۱۳ر رمضان ۱۳۵۴ھ کا واقعہ ہے کہ حضرت نے اس معاملہ کے متعلق فرمایا "میں ہمیشہ کہتا تھا کہ مختصر مختصر جو سامنے آئے اس کو لکھ ڈالو۔ پھر جو یاد آتا رہے گا اضافے ساری عمر کرتے رہنا کام اسی طرح ہوتا ہے مگر کوئی بڈھوں کی بات مانتا ہی نہیں۔ اپنی جوانی کے جوش میں جب کام لے کر بیٹھ جاتے ہیں تو یہ خیال کرتے ہیں کہ سب ہی کچھ لکھ ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ بھی نہیں لکھا جاتا۔ پھر یہ شعر پڑھا۔

نصیحت گوش کن جاناکہ از جان دوست تر دارند

جوانان سعادت مند پند پیر دانا را (۱)

مولانا مفتی صاحب نے حضرت خواجہ صاحب کی وفات پر مندرجہ ذیل مرثیہ کہا۔

دانی کہ زخم فرقت اشرف بما چہ کرد

زخمے دگر رسید و سر و جان و تن نماند

یا رب بخواب می شنوم یا حقیقت است

ایں ناشنیدنی کہ عزیز الحسن نماند!

ایں یادگار اشرف ماہم ز ما برفت

گم کردہ ایم یوسف و ہم پیرہن نماند

ہر روز بریگانہ اشرف چو سال بود

بعدش فزوں زسالے دم زیستن نماند

مشہور مزاح نگار شوکت تھانوی خواجہ عزیز الحسن مجذوب کے متعلق تحریر فرماتے ہیں " نہ خان بہادر نظر آتے ہیں نہ انسپکٹر آف سکولز کوئی کہہ سکتا ہے نہ شاعر۔ صورت دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ مسجد سے اذان دے کر تشریف لا رہے ہیں۔ بڑی سی داڑھی چوگوشیہ ٹوپی۔ لمبا سا کرتہ، اونچا سا پاجامہ۔ تسبیح کرتے کی جیب میں اور ہاتھ تسبیح کے اوپر۔

خواجہ صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے۔ سود کی ڈگری دینے کی بجائے محکمہ تعلیمات میں منتقل ہو جانا پسند کیا۔ اور اب تک اسی محکمہ میں ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے عشق کی حد تک عقیدت رکھتے ہیں اور حضرت مولانا کی توجہ نے ڈپٹی کلکٹر کو آدمی ہی نہیں بلکہ مسلمان بنا دیا ہے۔ شعر خوب کہتے ہیں اور نہایت کیف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ شعر پڑھتے ہوئے ان کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں ہیں صرف زبان سے نہیں سارے جسم سے شعر پڑھتے ہیں نہ داد لینے کا ہوش رہتا ہے نہ داد کی رسید دینے کا۔ خود ہی جس شعر کو چاہتا ہے

---

(۱) تحریر حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

پچاس دفعہ پڑھ جاتے ہیں اور جس شعر کو جی چاہتا ہے ایک ہی مرتبہ پڑھ کر رہ جاتے ہیں۔

رات میں کلام سنانا شروع کر دیں تو یہی کیفیت طاری ہو جائے۔ موٹر چلاتے چلاتے غزل جو سنانا شروع کی تو موٹر قلابازی کھا گیا۔ سب کو تھوڑی بہت چوٹ آئی اور خواجہ صاحب نے ہنس کر فرمایا لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ حضرت مولانا اسی دن کے لئے شعر خوانی سے منع فرماتے تھے۔

خواجہ صاحب بہت ہی عمدہ کہتے ہیں مگر کسی غزل میں ڈھائی سو اشعار سے کم نہیں کہتے اور پھر انتخاب نہیں کر سکتے۔ کہتے چلے جاتے ہیں اور کہہ چکنے کے بعد سنائے چلے جاتے ہیں۔ اشعار کے ان انباروں میں اچھے برے سب ہی قسم کے شعر ہوتے ہیں مگر اچھے زیادہ اور معمولی کم (۱)

رضا اللہ صاحب انصاری تحریر فرماتے ہیں۔

صف شعراء میں جب کبھی مجذوب صاحب کو دیکھا اساتذہ کے پہلو بہ پہلو پایا اور جب محفل کیتائی میں انہیں پایا تو آتش بجان معنی پایا۔ جب وہ نالہ کناں ہوتے تو اچھے سے اچھے شاعر خاموش سامع بن کر رہ جاتے۔ اس فضا میں جو مجذوب صاحب کی ترنم آواز اور بے چین جذبات سے ہمیشہ پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ بڑے بڑے سخن شناس وارفتہ ہو جاتے یا گم سم اور سب اس دعوٰے کے مؤید نظر آتے ہے

یہ معانی یہ حقائق یہ روانی یہ اثر !!

شاعری تری ہے اے مجذوب یا الہام ہے ؟

شاعر سب ہی پیدائشی ہوتے ہیں۔ اس لئے میں یہ نہیں کہتا کہ مجذوب صاحب پیدائشی شاعر تھے لیکن یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ مجذوب صاحب سرتاپا شاعر تھے۔ مجذوب صاحب سخت قسم کے مشرع بھی تھے اور صوفی بھی۔ صوفی صرف شاعرانہ حد تک نہیں بلکہ واقعتاً اپنے وقت کے سب سے بڑے شیخ طریقت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مرید خاص اور خلیفہ بھی تھے۔ شیخ کے انتقال کے بعد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ میں متوسلین کے حالات وکوائف کے نگران اور مشیر بھی۔ تو وہ مذہبی بھی تھے۔ صوفی بھی سرکاری افسر بھی تھے اور سرکاری فہرستوں میں خانصاحب اور خان بہادر بھی۔ پھر بھی میں انہیں سرتاپا

---

(۱) شوکت تھانوی شیش محل (لاہور، ۱۹۵۰ء) ص ۲۱۲

شاعر کہنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ شاعری اگر صرف قافیہ پیمائی کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت، اس شعور، اس احساس کا نام ہے جو ہر شاعر میں کم و بیش پایا جاتا ہے اور اس سے شعر کہلاتا ہے تو مجذوب پر یہ کیفیت اور یہ جذبہ ہر وقت طاری رہتا تھا۔ ہم دو تین صاحب زادگان فرنگی محل (بہ لحاظ عمر نہ بغرض احترام) مجذوب صاحب کی تلاش میں ان کے مکان واقع بنارسی باغ مغرب کے بعد پہنچے ۱۹۴۰ء کے آس پاس کی بات ہوگی اس وقت مجذوب صاحب انسپکٹر آف سکولز ہو چکے تھے اور خان صاحب خواجہ عزیز الحسن غوری انسپکٹر آف سکولز کہلاتے تھے۔ مکان یعنی سرکاری بنگلہ میں وہ ملے نہیں معلوم ہوا کہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔ دیر تک ہم نے ٹہل ٹہل کر انتظار کیا۔ آخر اس مسجد تک پہنچ گئے جہاں وہ نماز پڑھنے گئے تھے۔ وہ مسجد کے صحن میں دو زانو بیٹھ کر ایک طرف گردن ڈھلکائے اور اسے شانے پر لٹکائے تسبیح پڑھ رہے تھے تسبیح ان کے ہاتھ میں تھی اور پڑھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بالکل قریب جاکر سنا تو وہ گنگنا رہے تھے۔

پرواز ہے بلبل کا سا انداز نہیں ہے

جان باز ہے مجذوب سخن ساز نہیں ہے

کیا سکنت اور کیسی عاجزی تھی ان کی آواز میں۔ یہی جی چاہا کہ جس بے نیاز کو وہ اپنی سچائی کا یقین دلا رہے ہیں اس کے سامنے پہنچ کر ہم سب مجذوب صاحب کی صداقت کی فوراً گواہی دیں مگر وہ تو عالم السر والشہادت سے مصروف راز و نیاز تھے جس کے سامنے سوگند اور گواہ کی حاجت ہی نہیں ہوتی۔ مجذوب صاحب ہمہ تن اشتیاق اور سراپا شوق تھے۔ نماز میں ہوں سرکاری کام میں ہوں خالی بیٹھے ہوں یا انجمن میں ہوں تو ایک ہی لگی رہتی تھی۔ مجذوب نہ تھے۔ استن حنانہ تھے انھوں نے خود کہا تھا۔

غم فرقت میں ہوں استن حنانہ برسوں سے

شروع شروع میں جب یہ سنا کہ آج رات کو خواجہ صاحب یہاں فرنگی محل تشریف لائیں گے اور ایک نشست ہوگی تو ہم خوش ہو گئے۔ مجذوب صاحب آٹھ ساڑھے آٹھ بجے رات کو آ گئے۔ فراٹے بھر کر مجذوب صاحب کو دیکھنے پہنچ گئے۔ دیکھا کیا گورا چٹا لمبی سفید داڑھی والا سر پہ شاہ صاحبوں والی چوگوشہ ٹوپی پرانے ڈھنگ کا لمبا کرتہ جس میں بائیں سینہ سے متصل گھڑی اور قلم رکھنے والی جیب جو لکھنؤ کے خوش پوشاکوں پر ہمیشہ بار

رہی۔ آستینوں اور گلے میں لیس لگی ہوئی تخت پر بیٹھا دونوں ہاتھ اٹھائے دائیں بائیں جھوم جھوم کر ایسے انداز میں شعر پڑھ رہا ہے کہ شاعر کے ساتھ ساتھ سامعین بھی جھوم رہے ہیں اور کبھی کبھی چیخ پڑتے ہیں زیادہ تعداد علمائے فرنگی محل کی تھی۔ چھوٹی پود سب سے پیچھے ایک پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں پنسل کاغذ لے کر گیا تھا۔ اشعار نوٹ کرنے اور یہی سوچا کہ جس شعر کی زیادہ تعریف ہو اس کو لکھ لو مگر ایک بھی شعر ایسا نہیں کہ جس پر اہل علم سامعین نے جی کھول کر تعریف نہ کی ہو۔ مجذوب صاحب پڑھ رہے تھے۔

ہر تمنا دل سے رخصت ہو گئی	اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی
دل میں داغوں کی یہ کثرت ہو گئی	رونما اک شان وحدت ہو گئی
یاس ہی اب دل کی فطرت ہو گئی	آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی
پڑ گئی تھی ان پر بھولے سے نظر	بات اتنی سی قیامت ہو گئی
خاک میں کس نے ملایا یہ تو دیکھ	شکر کر مٹی سورات ہو گئی
ایسی ضد کا کیا ٹھکانہ ہے بھلا	بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی
جی رہا ہوں موت کی امید میں	مر ہی جاؤں گا جو صحت ہو گئی
دے گئی ان کی شکر رنجی مزہ	درد میں پیدا حلاوت ہو گئی
لاکھ جھڑکو اب کہیں پھرتا ہے دل	ہو گئی اب تو محبت ہو گئی
بخت خفتہ اور کب جاگے گا تو	اٹھ ارے صبح قیامت ہو گئی
کر چکے رندی بس اب مجذوب تم	ایک چلو میں یہ حالت ہو گئی

ظاہر ہے کہ مذکورہ بالا شعر سب ہی ایک درجہ کے نہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب مجذوب صاحب خود سنا رہے ہوں تو بڑے سے بڑے منکر کے بھی ممکن نہیں کہ وہ اس کیفیت میں جذب ہو کر جو خود مجذوب صاحب پر طاری رہتی تھی۔ ایک ایک شعر پہ سر نہ دھننے لگے۔ اشعار سناتے ہیں میں نے مجذوب کو بے ہوش ہوتے یا غش کھاتے تو نہیں دیکھا مگر مجذوب صاحب کے حرکات وسکنات تھے کچھ اسی طرح کے "غزل سنا رہے تھے" کہیں ہوتی نہیں ہوتی" جب یہ شعر پڑھا ۔

بتاتے ہم نشین ہر چند لیکن چشم گریاں پر
کبھی یہ آستیں ہوتی کبھی یہ آستیں ہوتی

تو پہلے داہنی آستین چشم گریاں پر رکھی پھر گویا ہم نشین نے ہاتھ اٹھا دیا تو بائیں آستین اس کی جگہ پر رکھ دی۔

ایک دفعہ یہ شعر پڑھا ؎

ہنس بھی دو ہنس دو ہاں ہاں چلو بس روٹھ چکے
اب ہنسے اب ہنسے دیکھو وہ ہنسی آئی ہے

دیکھو وہ ہنسی آئی ہے جب بھی کہا اس طرح کہا جس طرف انہوں نے اشارہ کیا اس کو ہنسی آ کے ہی۔ انھوں نے جب سنایا ؎

کسی کی یاد میں بیٹھے جو سب سے بے غرض ہو کر
تو اپنا بوریا بھی پھر ہمیں تخت سلیماں تھا

تو اپنی نشست پر اس طرح اکڑ کر بیٹھ گئے جیسے واقعی تخت سلیمان پر بیٹھے ہیں۔ مجذوب صاحب کی یہ پہلی نشست تھی۔ ہمارے یہاں آٹھ بجے رات سے مجذوب صاحب نے سنانا شروع کیا نہ وہ تھکے نہ سننے والے تھکے۔ فجر کی نماز کے وقت بادل نخواستہ محفل برخاست ہوئی۔ مجذوب صاحب چاہے ایک گھنٹہ سنائیں اور چاہے ۲۴ گھنٹہ سب زبانی سناتے تھے۔ ان کو سارا کلام حفظ تھا نہ بیاض کا جھگڑا نہ نوٹ بک کی قید۔ مجذوب صاحب کبھی ایک دفعہ میں پوری غزل نہ سکے۔ ایک غزل سناتے سناتے کوئی اور شعر کسی وجہ سے یاد آ گیا وہ سنایا اور اسی غزل پر چل نکلے۔ بیچ میں یاد آ گیا یا کسی نے یاد دلایا کہ فلاں غزل ہو رہی تھی۔ فوراً چونکے اور سابقہ غزل کی طرف پلٹ گئے۔ یہ سب سے اضطراراً ہوتا تھا غزل ہو رہی تھی ؎

یہ نالہ کناں کون بہ آواز حزیں ہے!
دیکھو کہیں مجذوب غزل خواں تو نہیں ہے

اسی اثنا میں چائے آگئی اور چھوٹے چھوٹے حسین فنجانوں میں مجذوب صاحب بے قرار ہو گئے۔ غزل چھوڑ چھاڑ گنگنانے لگے۔ اب جو شعر انہوں نے پڑھا وہ دوسری غزل کا مطلع تھا اور بے پناہ مطلع۔

آگئیں یاد وہ آنکھیں مجھے پیمانوں سے
غم میرا اور بڑھا عیش کے سامانوں سے

پھر اسی غزل پر چلائے۔

اجنبیت نہیں دل کو ترے پیکانوں سے
کچھ وہ گھل مل گئے ایسے مرے ارمانوں سے
یا تو ہم کو بھی اجازت ہو نہیں پھر بہر کرم
اس تصوّر کو بھی رکوا یئے دربانوں سے
شوق سے مٹھیاں بھر بھر کے مجھے مٹی دی
آج تو لاد دیا آپ نے احسانوں سے
کس قدر ہوش رُبا ہوتا ہے پر درد کلام
پوچھئے گفتہ مجذوب کے دیوانوں سے

مجذوب صاحب عام شاعروں کی طرح شعر گوئی میں ریاض کرنے کی زحمت میں کبھی نہیں پھنسے ایک ابال کی طرح جذبات ابلتے اور موزوں قالب اختیار کرتے چلے جاتے۔ کبھی کبھی جذبات کا دھارا اتنا تیز ہوتا کہ ایک زمین میں ڈیڑھ سو دو سو شعر تک کہہ ڈالتے تھے اور بلا انتخاب سنائے چلے جاتے تھے کم از کم تین غزلیں تو مجھے یاد ہیں جو ڈیڑھ سو دو سو اشعار کی ہیں۔ ایک میں ۲۵ مطلع ہیں۔ دوسری دو غزلوں میں بھی ۲۰ سے اوپر مطلع کہے ہیں۔ اپنا اعزاز وہ کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے۔ زبردستی جب کرسی صدارت بٹھائے جاتے تو فرماتے تھے۔

ہم خاک نشینوں کو نہ مسند پہ بٹھلاؤ
یہ عشق کی توہین ہے اعزاز نہیں ہے

اسی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تم سا کوئی ہمدم کوئی دمساز نہیں ہے
ہر وقت ہیں باتیں مگر آواز نہیں ہے
یہ نغمہ دلکش میرا بے ساز نہیں ہے
وہ بول رہے ہیں مری آواز نہیں ہے
ہم تم ہی بس آگاہ ہیں اس ربطِ خفی سے
معلوم کسی اور کو یہ راز نہیں ہے (۱)

حضرت تھانوی قدس سرہٗ کے ایک خادم جناب بشیر محمد صاحب اپنے تاثرات ان الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں۔

"راقم الحروف ہوشیار پور کے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ملازم تھا حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ذرہ نوازی سے بارگاہ اشرفی میں رسائی ہوئی اور پہلی مرتبہ ۱۹۲۰ء کے قریب حضرت والا کی زیارت نصیب ہوئی ؎

نسیم صبح تری مہربانی کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل

حضرت والا کی مجلس میں چند منٹ کی حاضری دنیا بھر کی دل چسپیوں کا نعم البدل تھی۔ جب وہ مجلس ختم ہوتی تھی تو حضرت خواجہ صاحب کے گرد و پیش لگے پٹے رہتے تھے۔ میں نے پہلی مرتبہ اس سراپا محبوبیت کو خانقاہ کے ایک کنارہ پر حجامت بنواتے دیکھا۔ حجام نصف خط کے قریب بنا چکا تھا۔ ایک دو صاحبان پاس آ بیٹھے۔ میں بھی ان کی اوٹ میں بیٹھ کر باتیں سننے لگا۔ تھوڑی دیر حجام کو ٹھہرا کر کلام سنانے لگے۔ کلام کیا سناتے تھے گویا دل و جان میں سمائے جاتے تھے۔ مندرجہ ذیل دو اشعار ان میں سے آج تک یاد ہیں اور حضرت کا سارے وجود باوجود ان کا پڑھنا اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

کہاں روئے زمیں پر ترے مستانے نہیں ساقی

---

(۱) یاد مجذوب رضاء اللہ انصاری صاحب [شعبہ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی]

بنا ڈالے ہیں لاکھوں آفریں صد آفریں ساقی

الٰہی خیر ہو مجذوب سے خانے میں آیا ہے

قدح کش لا ابالی جام نازک نازنیں ساقی

یہ کیف آفریں ماحول دس پندرہ منٹ قائم رہا اور حجام اپنا کام بھول کر جھوم رہا تھا۔ اس وقت سے خواجہ صاحب ایسے چھائے کہ جہاں وہ رونق افزا ہوئے کسی حیلہ بہانہ سے دل وہاں پہ کھینچ لے جاتا۔

مَیں بھی ان پہ مرمٹا ناصح تو کیا بیجا نہ تھا

اک مجھے سودا تھا دنیا بھر تو سودائی نہ تھی

پھر اس کے بعد تین چار مرتبہ تھانہ بھون حاضری کا موقعہ ملتا رہتا۔ جب گھر سے روانہ ہوتا تو جہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جمال جاں فزا کا اشتیاق ہوتا وہاں خسرو دربار اشرفی کے نغمات سے محفوظ ہونے کا شوق بھی ہوتا۔

احقر ہوشیار پور سے بڑی بڑی ریوڑیاں جو وہاں کا تحفہ شمار کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی حضرت والا کے لئے باجازت لے جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جی چاہا کہ حضرت خواجہ صاحب بھی اس کا ذائقہ چکھیں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے توسط سے پیش کرنے پر قبول فرما کر پسند فرمائیں۔ اس کے بعد حضرت والا کے لئے بھی لانے کو جی چاہتا جو تھوڑی سی مقدار میں قبول کر کے دل جوئی فرماتے۔ ایک مرتبہ احقر کے لئے اپنے وطن سے لڈو لائے اور فرمایا کہ "چلتے وقت تمہارا خیال آیا تھا اس لئے لایا ہوں" یہ جملہ اتنا جان نواز تھا کہ اس کی شیرینی آج تک کام و دہن کو شیریں کئے ہوئے ہے۔

جب بندہ یہ حرف لکھنے بیٹھا تو کچھ مصرعے فرط محبت میں موزوں ہو گئے گو بندہ کو اس میں دسترس نہیں ہے لیکن یہ خواجہ صاحب کی برکت تھی کہ چند منٹوں میں سپرد قلم ہو گئے۔

نذرِ عقیدت بجناب مجذوب

اے خسرو تھانہ بھون — اے شمع بزم اشرفی

اے بلبل شیریں نوا — اے نغمہ سنج تیالوی

وہ افسری پر سادگی
تھی روکش صد خواجگی!

وہ چال میں وارفتگی!
ایک بات میں سو دل کشی

کیا خواجگی سی خواجگی
کیا دلبری سی دلبری!

وہ خلق سے بے گانگی
مولا سے وہ ہم خانگی

دیکھی تیری دیوانگی
جانچی تری فرزانگی

اس خانقاہ کی رونقیں
دو بالا ترے دم سے تھیں

وہ میکدہ کی زینتیں
وابستہ ترے دم سے تھیں

اس پر سکون ماحول کی
تو عندلیب جان نواز

اس پر شکوہ ایوان کی
تو بلبل صد نغمہ ساز

تو نے جاں کی جاں جاناں پر فدا
مرحبا اے خواجہ ما مرحبا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمت اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں "حضرت خواجہ عزیزالحسن صاحب غوری مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق کیا تحریر کروں سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ میرا اور ان کا خصوصی اور ذاتی تعلق ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۴۴ء تک یعنی ۳۰ سال تک رہا۔ مگر میں حیران ہوں کہ کس خصوصیت کا ذکر کروں وہ تو ایک عجیب و غریب ہستی تھے۔

گر مصور صورت آں دلستاں خواہد کشید
لیکن حیرانم کہ نازش راچساں خواہد کشید

خواجہ صاحب فرشتہ سیرت اور فرشتہ صورت انسان تھے۔ نہایت زندہ دل اور بذلہ سنج خداداد شاعر اور سراپا شعر یعنی شعر مجسم جس جگہ اور جس مجلس میں بیٹھ جاتے تھے تو اپنے انداز شعر خوانی اور کیفیات باطنی سے سامعین کو مسحور اور مدہوش فرما دیتے تھے اور جب کبھی خلوت ذکر اللہ میں مشغول ہوتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ در و دیوار وجد میں ہیں۔

حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرشد قدس سرہ العزیز کی وفات کے بعد یہ شعر پڑھے والہانہ

انداز سے پڑھا کرتے تھے ۔ وہی شعر میں اب ان کے لئے پڑھا کرتا ہوں ۔

محبت کی پُر پیچ راہوں سے آ کر

کہاں چھپ گئے اپنا جلوہ دکھا کر (۱)

سوز شاہجہاں پوری صاحب حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارہ میں یوں رقم طراز ہیں ۔

"نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد

حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

خواجہ صاحب کے متعلق لکھنے سے پہلے چند چیزوں کا ذہن میں احاطہ کرنا ضروری ہے ورنہ لکھنے والے کا حق ادا ہونا تو درکنار موضوع کی نزاکتوں سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہو جائے گا ۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام

آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا !!

پہلی چیز ان کے اپنے شیخ (حضرت مجدد تھانوی اعلی اللہ مقامہ) سے والہانہ عقیدت و شیفتگی دوسری چیز ان کی شاعری جو نفس نفس میں جاری و ساری تھی تیسری چیز تقوی جس نے ڈپٹی کلکٹری چھڑوائی اور چوتھی چیز جسے آپ عالم خود فراموشی کہہ لیجئے ۔ اور جس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا ۔ یہ استغراقی کیفیت باتیں کرتے وقت طاری ہو سکتی تھی ۔ چلتے پھرتے ہنستے بولتے اس عالم سے دوچار ہو جاتے تھے خصوصاً شعر پڑھتے وقت تو یہ کیفیت انتہائی عروج کو پہنچ جاتی تھی ۔ اس برصغیر پر آباد شعراء کرام کی فوج ظفر موج میں ایک خواجہ صاحب ہی ایسے شاعر نظر آئے جنہیں داد سے ہمیشہ مستغنی پایا ۔ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ سامعین پر کیا ردعمل مرتب ہو رہا ہے داد دے رہے ہیں یا خاموش بیٹھے ہیں وہ تو آنکھیں بند کئے ہوئے عالم بے خودی میں شعر پڑھ رہے ہیں اور مسلسل پڑھ رہے ہیں ، ایسے عالم میں اگر آپ ان کے مخاطب الیہ کو تلاش کرنا چاہیں تو اس شعر میں تلاش کیجئے ۔

بنام شاہد نازک خیالاں عزیز خاطر آشفتہ حالاں

---

(۱) مکتوب گرامی حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب

خواجہ صاحب کے ہر شعر میں یہ نسبت موجود ہے اب پرکھ اور نظر اپنی اپنی ہے جسے جس جہاں کا معاملہ نظر آئے یہ اپنے اپنے ذوق اور وجدان پر منحصر ہے۔

ایک مرتبہ انجمن بہار ادب لکھنؤ کا کل ہند سالانہ مشاعرہ تھا۔ خواجہ صاحب بھی بحیثیت شاعر مدعو تھے راقم الحروف سٹیج سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ تقریباً ۲ بجے رات کو خواجہ صاحب کا نمبر آیا تو لوگ ان کے ظاہر کو دیکھ کر ہنس دیئے۔ لمبا قد۔ سرخ و سپید رنگ۔ سفید داڑھی۔ چوگوشیہ ٹوپی۔ سفید براق سا۔ اچکن نما انگرکھا اور پاجامہ۔ ایک آواز اٹھی "یہ مسجد نہیں ہے"۔ کسی ظریف الطبع نے پچھلی نشستوں سے اذان دینا شروع کر دی۔ خواجہ صاحب مجمع کی اس نامعقولیت کو نظر انداز کرتے ہوئے مائیک کے سامنے تشریف لائے اور اپنے مسحور کن ترنم اور والہانہ انداز میں یہ مطلع پڑھا۔

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

کہاں تو مجمع ہوٹنگ کے موڈ میں تھا اور کہاں اس مطلع کے بعد سناٹا چھا گیا۔ کچھ باذوق حضرات نے "مکرر ارشاد" کی فرمائش کی۔ خواجہ صاحب نے دوبارہ مطلع پڑھا۔ اب مجمع بھی سنبھل چکا تھا اور پھر جو داد کا طوفان اٹھا تو کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ مطلع کے بعد جب یہ شعر مجذوب صاحب نے پڑھا تو مشاعرے میں پٹس پڑ گئی ؂

زبردستی لگا دی آج بوتل منہ سے ساقی نے
میں کہتا ہی رہا ہاں ہاں نہیں ساقی نہیں ساقی

اب ادھر داد کے ڈونگرے برس رہے ہیں اور ادھر خواجہ صاحب ایک عالم بے خودی میں غزل سرا تھے۔ خدا خدا کر کے غزل ختم ہوئی تو "ایک اور ایک اور" کی فرمائشوں نے پنڈال سر پہ اٹھا لیا اور جناب اس ایک اور کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کے بعد دوسری پھر تیسری اور چوتھی غرض کہ صبح کی اذان سن کر خواجہ صاحب چونکے اور غزل سرائی کا سلسلہ ختم ہوا حالانکہ مجمع اب بھی سننے پر مصر تھا مگر خواجہ صاحب مسجد کو سدھارے اور مجلس برخاست ہوئی۔ اس سلسلے میں منتظمین مشاعرہ کو بعض تلخیوں سے بھی واسطہ پڑا۔ یعنی وہ بزرگ اساتذہ و مشاہیر جو مجذوب صاحب

کے بعد پڑھنے والے تھے نہیں پڑھ سکے اور خفا ہو کر چلے گئے۔ اب چونکہ خواجہ صاحب کی شاعری کا ذکر چھڑ گیا ہے لہٰذا مناسب ہوگا کہ اس قبیل کے چند واقعات اور عرض کر دوں، یہ اس وقت کا ذکر ہے کہ جب مجذوب صاحب انسپکٹر آف سکولز کی حیثیت سے لکھنؤ میں مقیم تھے۔ جمعہ کا دن تھا اور شدید لو چل رہی تھی میں جوش صاحب کے یہاں سے ایک بجے کے قریب اٹھا۔ جوش صاحب اس وقت چڑیا گھر کے قریب رہا کرتے تھے میں ابھی تھوڑی ہی دور چلا تھا کہ سامنے سے خواجہ صاحب آتے دکھائی دیئے۔ لُو اور دھوپ سے بچاؤ کے لئے ایک بڑا سا رومال سر پہ ڈالے اور کونے دانتوں میں دبائے نظریں نیچی کئے خراماں خراماں جب قریب آئے تو مجھ پر نظر پڑی۔ سلام دعا کے بعد پوچھا کہاں سے آ رہے ہو۔ پھر میرے جواب پر مسکرائے اور حسب عادت دو ایک شعر پڑھے اور پھر تو جواب والا یہ سلسلہ اتنا طویل ہوا کہ تقریباً دو کا عمل ہو گیا۔ لُو کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ سڑک پر کھڑا ہونا مشکل ہے۔ سننے والے کے حلق میں کانٹے پڑ گئے مگر پڑھنے والے پر موسم کی شدت کا کوئی اثر نہیں کہ دفعتاً مجذوب صاحب شعر پڑھتے پڑھتے چونکے اور توبہ و استغفار کرتے ہوئے مسجد کی طرف لپکے اور میں نے بھی یہ سمجھ کر کہ اب محلہ کی مسجد تک پہنچنا مشکل ہے مجذوب صاحب کی تقلید کی۔

حضرت مجذوب راقم الحروف پہ انتہائی کرم فرماتے تھے۔ اس دور میں شام کو نعمت اللہ ہاؤس میں محفل جمتی تھی۔ اس محفل کے شرکا میں چودھری نعیم اللہ صاحب ڈاکٹر معراج رسول صاحب کبھی کبھی لائق علی خان صاحب (نواب صاحب پریانواں کے صاحبزادے) عبدالوحید خاں۔ مولوی عبدالوحید خاں صاحب چودھری نعمت اللہ صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ ہوتا یہ تھا کہ خواجہ صاحب بعد نماز عصر اپنے مکان واقع حضرت گنج سے چلتے تھے اور امین آباد میں انوار بک ڈپو پر آکر ٹھیکی لیتے تھے اور پھر بعد نماز مغرب اکثر نعمت اللہ ہاؤس میں محفل شعر و سخن ہوتی تھی اور رات گئے تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس دوران خواجہ صاحب کے صاحبزادے خواجہ فیض الحسن مرحوم موٹر لئے لاٹوش روڈ پر موجود رہتے تھے (یہ وہ جگہ تھی جہاں مجذوب صاحب موٹر چھوڑ کر پیدل انوار بک ڈپو تک آتے تھے) اس ضمن میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ ایک روز عشاء کے وقت سے بارش شروع ہو گئی اور کسی طرح رکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ بارے کوئی دو بجے کے قریب کچھ زور کم ہوا تو خواجہ صاحب کو دوسری سواری سے حضرت گنج پہنچوا دیا گیا۔ صبح نماز کے وقت خواجہ صاحب کو صاحبزادہ اور موٹر کا خیال آیا

آدمی دوڑایا گیا۔ معلوم ہوا کہ صاحبزادے صاحب اس تمام بادو باراں میں موٹر لئے انتظار کرتے رہے۔ اس واقعہ کو مجذوب صاحب نے خود بیان کیا۔ خیر تو ذکر خواجہ صاحب اور ان کی شاعری کا ہو رہا تھا۔ ایک مرتبہ بنارس میں آل انڈیا مشاعرہ ہوا۔ خان بہادر رحمٰن بخش قادری وہاں کلکٹر تھے۔ غالباً مشاعرے کی کچھ سرکاری حیثیت بھی تھی اس لئے کہ مشاعرہ کمیٹی کے صدر خود قادری صاحب تھے۔ میں نے مشاعرہ کے لئے ایک تازہ غزل کہی۔ شام کو اپنی محفل غزل کا ذکر ہوا۔ پھر اہل محفل کی فرمائش پر غزل سنائی گئی۔ مجذوب صاحب کو وہ غزل بہت پسند آئی۔ کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا اور دیر تک دیکھتے اور اتفاق سے پھر وہ کاغذ خواجہ صاحب کے پاس رہ گیا۔ تاریخ مشاعرہ سے دو روز قبل میں دفعتہً بیمار ہو گیا اور مشاعرہ میں نہ جا سکا۔ خواجہ صاحب تشریف لے گئے اور جب مشاعرے میں ان کے پڑھنے کا وقت آیا تو اپنی غزل کے بجائے میری غزل پڑھی کہ سوز شاہجہاں پوری کی یہ تازہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ آپ حضرات بھی سنئے! اس واقعہ کے بہت سے ناقلین آج بھی موجود ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد میں ایک دوسرے مشاعرے میں جب بنارس پہنچا تو اکثر حضرات نے مجھے یہ روداد سنائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ تمہاری غزل بھی اسی کیف اور والہانہ انداز میں پڑھی گئی جیسے خواجہ صاحب عام طور پر پڑھتے ہیں۔ اسی غزل کا ایک شعر یاد آگیا آپ بھی سن لیجئے۔

تو رمیدگی سراپا میں اسیر کج ادائی

تو حدیث جور پیہم میں قتیل بے گناہی

خواجہ صاحب کو اچھے شعر سے ربط تھا۔ خواہ ان کا ہو یا کسی اور کا اور یوں بھی شعراء کی عام سطح سے وہ بہت بلند تھے اور مزاجی اعتبار سے بہت مختلف تھے۔

خواجہ صاحب سے متعلق بعض واقعات ایسے ہیں جو اپنی نزاکتوں کی وجہ سے ضبط تحریر میں نہیں لائے جا سکے۔ اس لئے کہ ان میں رموز و نکات پنہاں ہیں۔ انہیں آج کا ایک عام قاری سمجھ ہی نہیں سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ ایسی چیزیں پڑھ کر اس کی ذہنی رو بھٹک جائے مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ ان واقعات کو اس زاویے سے دیکھے اور سمجھے جس زاویے سے مجذوب صاحب کے قریب رہنے والے دیکھتے اور سمجھتے تھے لہٰذا ایسے واقعات کا بیان نہ کرنا ہی مناسب ہے۔

جس زمانے میں جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی وہ مشہور رباعی تخلیق فرمائی تھی جس کا ایک مصرعہ یہ ہے

کہ ؎ خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

اور یہ رباعی ہر مشاعرے میں سنی جاتی تھی۔ اس زمانے میں خواجہ صاحب نے اسی زمین اور انہی قوافی ردیف میں ایک نظم مسلسل شروع کی۔ یہ نظم جوشؔ صاحب کی رباعی کے جواب میں تھی۔ خواجہ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ یہ تو اپنا اپنا معاملہ ہے۔ انہیں یہ توفیق ہے کہ وہ اس طرح کی رباعی کہیں۔ ہمیں یہ توفیق ہے کہ اس طرح کا منہ توڑ جواب دیں۔ اور صاحب کیا آمد تھی اس نظم میں اور کس جذبے سے پڑھتے تھے معلوم ہوتا تھا کہ جہاد کر رہے ہیں۔ اس نظم میں ایک قافیہ "کیلئے" بھی استعمال ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قافیہ مناسب نہیں ہے فرمایا کہ جوشؔ نے جو کہا ہے وہ مناسب ہے؟ یہاں مناسب و ناسب کچھ نہیں ایسی ہی ضرب شدید کی ضرورت ہے۔ بارے وہ تصفیہ بھی رفع دفع ہو گیا۔ یہ تصفیہ بھی اپنی جگہ دل چسپ ہے۔ ہوا یوں کہ مولانا وصل بلگرامی کی یہ کوشش رہی کہ کسی طرح یہ معاملہ رفت وگذشت ہو جائے وہ بیچارے برابر اسی تگ و دو میں لگے رہے۔ آخر کار جوشؔ صاحب اس امر پہ راضی ہو گئے کہ خواجہ صاحب سے معذرت کر لیں گے اس کارِ خیر کے لئے اتوار کا دن مقرر ہوا۔

خواجہ صاحب کی سرکاری رہائش گاہ حضرت گنج میں تھی۔ مختصر یہ کہ مولانا وصل بلگرامی، حضرت جوشؔ ملیح آبادی، مولانا قدیرؔ لکھنوی اور راقم الحروف پہنچے مجذوب صاحب کے گھر۔ مگر خلاف معمول آج یہاں کافی مجمع تھا۔ استفسار پہ ایک صاحب نے بتایا کہ آج مختلف اضلاع کے ڈپٹی انسپکٹروں اور ہیڈ ماسٹروں کی پیشی ہے بہرحال وصل صاحب نے ایک کاغذ کے پرزے پر جوشؔ صاحب کا نام لکھ کر اندر بھجوا دیا مگر جب کافی وقت گزر جانے کے بعد شنوائی نہ ہوئی تو جوشؔ صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ سخت ناراض وصل صاحب سے مخاطب ہو کر بولے کہ آپ نے یہاں لا کر میری سخت توہین کرائی ہے۔ میں اس بے عزتی کو برداشت نہیں کر سکتا وغیرہ وغیرہ۔ وصل صاحب بھی اپنی جگہ شرمندہ نظر آ رہے تھے۔ بالآخر ایک مرتبہ لپک کر وصل صاحب نے چق اٹھائی اور ہم سب اندر۔ خواجہ صاحب اس مجمع کو دیکھ کر کھڑے ہو گئے، وصل صاحب نے شکایتاً کہا کہ حضرت جوشؔ صاحب اتنی دیر سے باہر کھڑے تھے اور آپ مزے سے اندر بیٹھے ہوئے مقدمات

کی سماعت کر رہے ہیں۔ خواجہ صاحب نے حیرت زدہ ہو کر کہا کہ واللہ واللہ مجھے خبر ہی نہیں۔ وصل صاحب نے ان ہی کے سامنے سے وہ چٹ اٹھا کر دکھائی یہ کیا ہے؟ فرمایا کہ مَیں سمجھا وہ ڈپٹی انسپکٹر جوشی ہے جو ایک معاملے میں ماخوذ ہے۔ اب جو ہم لوگوں نے وہ پرزہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ جناب وصل بلگرامی نے انگریزی میں جوش صاحب کا نام اس طرح لکھا تھا جو بادی النظر میں جوشی پڑھا جاتا تھا یعنی یوں JOSHE ۔ جوش صاحب نے معذرت کی کہ میرا مفہوم اس رباعی میں یہ ہے اور میرے مخاطب آپ حضرات نہیں اور دراصل مصرعہ کا مطلب یہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ خواجہ صاحب نے صرف اتنا کہا کہ معذرت آپ اللہ پاک سے کیجئے ورنہ مَیں زندگی بھر اسی ایک قافیہ میں آپ کے خلاف کہتا رہوں گا۔

آخر میں چلتے چلتے خواجہ صاحب کی بذلہ سنجی وحاضر جوابی کے دو ایک نمونے بھی ملاحظہ فرما لیجئے۔ وصل صاحب سے اکثر چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی۔ ایک بار جناب وصل صاحب نے پوچھا کہ خواجہ صاحب آپ خواجہ ہیں یا خوجہ۔ مجذوب صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ بھائی "وصل میں الف محذوف ہو گیا"۔ ایک بار لکھنؤ میں ڈاکٹر سید علی حماد رضا صاحبؒ کے مطب مولوی گنج والے میں خواجہ صاحب تشریف لائے۔ دن کے تقریباً دس بجے تھے۔ مَیں اور شوکت تھانوی مرحوم بھی کہیں ادھر آ نکلے۔ بس پھر کیا تھا جم گئی محفل اور دس بجے تھے اور ڈاکٹر کے مطب میں شعر وسخن کا بازار گرم ہو گیا اور ظہر تک گرم رہا۔ اس محفل کا یہ واقعہ بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ خواجہ صاحب غزل پڑھ رہے تھے اور مطب بھر جانے کے بعد باہر فٹ پاتھ تک ہر لوگ کھڑے تھے کہ سامعین میں سے کسی نے داد کے طور پر کہا کہ "واہ کیا بانکپن ہے"۔ خواجہ صاحب نے فوراً مخاطب ہو کر کہا "جنہیں بانکپن نظر آتا ہے وہ کہتے نہیں" اور پھر شعر پڑھنے لگے حالانکہ یہ انداز ان کی عام مزاجی کیفیت سے مختلف ہے لیکن کبھی کبھی اس انداز میں بھی نظر آتے تھے۔ ایسی ہی ایک صحبت میں ایک بار مَیں نے یہ شعر پڑھا ؎

تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون من ریزی!

من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم!

شعر سن کر خواجہ صاحب کی حالت متغیر ہو گئی آنسو بہنے لگے۔ بڑی دیر کے بعد تشریف لے گئے خواجہ صاحب

کا وہ دَور بھی بڑا عجیب ہے جب ان پر شعر گوئی و شعر خوانی کے سلسلے میں قدغن تھی جن حضرات نے وہ دَور دیکھا ہے کچھ وہی جانتے ہیں کہ اس حکم کی تعمیل میں خواجہ صاحب پر کیسے کیسے عالم گزر گئے اور ان کی قوت برداشت کس طرح بروئے کار آئی اور حقیقت یہ ہے کہ مجذوب صاحب نے اسی ایک معاملہ میں ضبط نفس کا جو ثبوت دیا ہے۔ وہ ان کی ذہنی بلندی کا آئینہ دار ہے۔

خواجہ صاحب کے تقویٰ و طہارت، حقوق اللہ و حقوق العباد اپنے شیخ سے والہانہ عقیدت و شیفتگی اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات پر لکھنے والے بہت ہوں گے۔ مَیں نے بھی چند کلمے اس ضمن میں محترم ڈاکٹر عبدالحئی عارفی مدظلہ کے دیوان پر تبصرہ کرتے وقت خواجہ صاحب پر لکھے ہیں لیکن خواجہ صاحب کی زندگی کے جس پہلو پر اس صحبت میں روشنی ڈالی ہے۔ اس انداز پر لکھنے والے شائد کمتر ہی ہوں۔ اس لطف صحبت کو وہی محسوس کر سکتے ہیں جن کو حضرت خواجہ صاحب سے نسبت رہی ہو اور جنہوں نے اس درویش صفت مجذوب سے کچھ استفادہ بھی کیا ہے۔ اس دور میں خواجہ صاحب ایسے لوگ عنقا کا حکم رکھتے ہیں کیا خوب کہا میر تقی میر نے ؎

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس، تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

میرؔ کے اس شعر میں لفظ پراگندہ آشفتہ مزاجی یا ذہنی انتشار کے معنی میں استعمال ہوا ہے جو ہرچند کہ خواجہ صاحب کے کردار کی ترجمانی نہیں کرتا لیکن پھر بھی شعر کے مجموعی تاثر سے بڑی حد تک مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ خواجہ صاحب کی ذات سے شعریت کو الگ کر دیا جائے تو وہ ایک شخصیت رہ جائے گی جو متقی بھی ہے اور پرہیزگار بھی شریف النفس بھی ہے اور عابد شب زندہ دار بھی صائم النہار بھی ہے اور قائم اللیل بھی بندہ مومن بھی ہے اور عاشق رسولؐ بھی غرض کہ وہ شخصیت سبھی کچھ ہو سکتی ہے مگر مجذوب نہیں ہو سکتی۔

مجھے افسوس ہے کہ حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ کے وہ مکتوب گرامی جو موصوف نے وقتاً فوقتاً مجھے لکھے تھے اور جن کو میں نے بڑی احتیاط سے رکھا تھا نہ معلوم کہاں کھو گئے اور انتہائی کوشش کے

باوجود اس ذوقت نہ مل سکے ورنہ اس تشنہ مضمون کی آبرو رہ جاتی خیر!

اس لذیذ حکایت کو جسے دراز تر ہونا چاہیئے تھا مختصر کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر اختصار بھی بہرحال اپنی جگہ ایک حسن ہے لہٰذا میں اس مضمون کو اس شعر پر ختم کرتا ہوں ؎

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

حضرت مولانا عبدالماجد دریاآبادی صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

خواجہ صاحب میرے بڑے ہی کرم فرما تھے۔ برسوں تعلقات بڑے ہی شگفتہ کوئی ۱۵۔۲۰ سال کی مدت تو ضرور ان تعلقات کی رہی ہوگی۔ بڑے اچھے انسان، بڑے سادہ عادات کے پوری کمشنری کے انسپکٹر آف سکولز تھے مگر مزاج میں تمکنت کا نام نہیں۔ وضع قطع میں ایسے کہ کوئی پہچان نہیں سکتا کہ اتنے بڑے افسر ہیں۔ خاکساری اور فروتنی کے پتلے۔ بڑے ہی اچھے شاعر اور شاعری بھی ہائے مست۔ جہاں شعر پڑھنا شروع کر دیتے بس نہ وقت کا ہوش رکھتے نہ کھانے پینے کا۔ اگر کہیں کھڑے ہیں تو بس کھڑے ہی رہ گئے۔ اگر کوئی دوست ہوتو برابر ڈرتے ہی رہتے کہ موٹر کا حادثہ نہ کر دیں۔ لکھنؤ میں شعر خوانی میں ۷۔۸ گھنٹے گزار کر صبح کر دی۔ ہوش بس نماز فجر کے وقت آیا۔ اپنے شیخ کے عاشق صادق تھے تخلص مجذوب۔ شیخ کا ہی عطا کردہ تھا۔ واقعتہً بھی کچھ نیم مجذوب سے تھے۔ مولانا تھانوی کے خلیفہ مجاز تو تھے مولانا کے عاشقوں کے بھی سرگروہ تھے۔ چہرہ بڑا نورانی قلب نورانیت میں شاید اس سے بھی بڑھ کر اپنے سرکاری کام میں مروت یا کسی ذاتی اثر کا ذرا دخل نہ آنے دیتے تھے یہ ایک کرامت ہی تھی۔ سیدھے جنتی بہشتی تھے۔ (۱)

ایک بار شبلی منزل میں حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا مسعود علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے اکابر کا اجتماع ہوا۔ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود تھے۔ وہاں کے مشہور شاعر جناب سہیل صاحب مرحوم بھی تھے۔

---

(۱) مکتوب گرامی مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی۔

حضرت خواجہ صاحب نے اپنی غزل پڑھی جس کا ایک شعر یہ ہے۔

یہ کون آیا کہ دھیمی پڑ گئی تو شمع محفل کی
پتنگوں کے عوض اڑنے لگیں چنگاریاں دل کی

یہ شعر پڑھ کر سہیل صاحب سے دریافت فرمایا کہ کچھ سمجھ میں آیا۔ عرض کیا حضرت دماغ کا یہاں کام نہیں ہے یہاں تو دل کا کام ہے۔ اہلِ دل ہی اس کلام کو سمجھ سکتے ہیں۔ حضرت مولانا عبدالغنی پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر کے متعلق فرمایا "اس شعر سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت خواجہ صاحب کے قلب پر کسی خاص تجلّی ربانی کا ظہور تھا۔" (۱)

---

(۱) معرفت الٰہیہ

کلام

حمد

ظاہر مطیع و باطن ذِکر مدام تیرا
زندہ رہوں الٰہی ہو کر تمام تیرا

بگڑے نظامِ دین کو میرے بھی ٹھیک کر دے
ہر دو سرا میں کیا کیا ہے انتظام تیرا

باطن میں میرے یارب بس جائے یاد تیری
ہر دم رہے حضوری دل ہو مقام تیرا

مونس ہو میری جاں کی فکر مدام تیری
ہمدم ہو میرے دل کا فکرِ دوام تیرا

دل کو لگی رہے دھن لیل و نہار تیری
مذکور ہو زباں پہ ہر صبح و شام تیرا

مورد رہے یہ ہر دم تیری تجلیوں کا
ہو جائے قلب میرا بیت الحرام تیرا

سینہ میں ہو منقش یارب کتاب تیری
جاری رہے زباں پہ ہر دم کلام تیرا

ہے خوبی دو عالم اِک حسن خاتمہ پہ
کرنا سر اس مہم کا ادنیٰ ہے کام تیرا

رگ رگ میں تیرے ہر دم ہو صدق یقیں کے ہا عشق
تیرے نبی کی وقعت اور احترام تیرا

اپنے کرم سے کرنا مجھ کو بھی ان میں شامل
جن پر عذاب ہوگا یارب حرام تیرا

محشر میں ہو پہنچ کر اس تشنہ لب کے حاصل
تیرے نبی کے ہاتھوں کوثر کا جام تیرا

دونوں جہاں میں مجھکو مطلوب تو ہی تو ہے
ہو پختہ کارِ وحدت مجذوب خام تیرا

نعت

اِتنا ہوا قریب کہ وہ دُور ہوگیا
اتنا ہوا عیاں کہ وہ مستور ہوگیا

آیا جو سامنے وہی مسحور ہوگیا
زنارِ کفر توڑ کے ذوالنور ہوگیا

سوئے مدینہ جانے کا مقدور ہوگیا
سامان راحت دل رنجور ہوگیا

جس دم تصور رُخ پُر نور ہوگیا
سینہ تمام نور سے معمور ہوگیا

کیا فیض تھا کہ پڑگئی جس پہ بھی اِک نظر
رشک جنید و شبلی و منصور ہوگیا

ہر قول و فعل حضرت محبوب کبریا
تا حشر خلق کے لئے دستور ہوگیا

کیا حلہ ہے فیض شافع محشر تو دیکھئے
مجھ سا گنہ گار بھی مغفور ہوگیا

مجذوب کی معاف ہیں سب ہرزہ گوئیاں
اک شعر بھی جو نعت کا منظور ہوگیا

اے خضر راہ بے خبر اے جذب کردِ
مجذوب قافلے سے بہت دُور ہوگیا

بس اب تو ایک یہی میرا کام ہو جائے
اسی پہ اب مجھے حاصل دوام ہو جائے
مدینہ جاؤں پھر آؤں مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

○

چمکنے لگا سر بسر نور ہو کر　　مَیں جل جانے والا نہیں طور ہو کر

نہ پاس آؤ اتنے چلو دور ہو کر　　مَیں کچھ اور کہہ دوں نہ منصور ہو کر

سرِ دار ہو کر سرِ طور ہو کر　　ترے پاس آیا، بڑی دُور ہو کر

نہ ترساؤ ہر گام پر دُور رہ کر　　کوئی ہار بیٹھے نہ مجبور ہو کر

بدلنے لگے کروٹیں اہلِ مرقد　　ذرا دور ہو کر ذرا دور ہو کر

حدیں عشق کی کر رہے ہیں وہ قائم　　کبھی پاس آ کر کبھی دور ہو کر

مجھی میں تو رہتے ہیں مستور ہو کر　　وہ دِل کا سرور آنکھ کا نور ہو کر

تنِ یاسمین پر لباسِ مصفا　　وہ آئے ہیں نورٌ علیٰ نور ہو کر

وہ نظروں میں میری کھُبے جا رہے ہیں　　سراپا ادا چشمِ بد دُور ہو کر

نظر کیا کروں اب سوئے جام و مینا　　تری مست آنکھوں کا مخمور ہو کر

وہ خوش بخت و خوش وقت مجذوب ہیں ہم
غموں میں بھی رہتے ہیں مسرور ہو کر

○

○

تیری بلا سے کچھ بھی ہو تو تو ادا دکھائے جا
روتا ہے رونے کل جہاں تو یونہی مسکرائے جا

ہاں مجھے مثل کیمیا خاک میں تو ملائے جا
شان میری گھٹائے جا رتبہ مرا بڑھائے جا

کھولیں وہ یا نہ کھولیں در اس پہ ہو کیوں تری نظر
تو تو بس اپنا کام کر یعنی صدا لگائے جا

دیکھ یہ راہ عشق ہے ہوتی ہے بس یونہی یہ طے
سینہ پہ تیر کھائے جا آگے قدم بڑھائے جا

بیٹھے گا چین سے اگر کام کے کیا رہینگے پر
گو نہ نکل سکے مگر پنجرہ میں پھڑپھڑائے جا

کیسی یہ آج کل نئی نکلی ہے رسم دوستی
دل میں ہے لاکھ دشمنی ہاتھ مگر ملائے جا

○

نگاہ اقربا بدلی مزاجِ دوستاں بدلا
نظر اک ان کی کیا بدلی کہ مجھ سے کل جہاں بدلا

چمن کا رنگ گو تو نے سراسر اے خزاں بدلا
نہ ہم نے شاخ گل چھوڑی نہ ہم نے آشیاں بدلا

سرِ بازار حسن و عشق کی رسوائیاں توبہ
شعارِ مہوشاں بدلا مذاق عاشقاں بدلا

خوشا یہ دن کہ میری زیست آخر مرگ سے بدلی
بالآخر خواب راحت سے میرا خواب گراں بدلا

طریق عشق میں گو کارواں پر کارواں بدلے
نہ ہم نے رہگذر بدلی نہ میر کارواں بدلا

نظر میں اب تو اے مجذوب ہے اک کھیل ہے دنیا
نظر کے سب تماشے تھے نظر بدلی جہاں بدلا

سنبھل کر ذرا تیز گام محبت
مقام ادب ہے مقام محبت

ارے اک نظر اس طرف بھی خدارا
بپاس مروت بنام محبت

محبت کے بدلے محبت ستم ہے
نہ لے اف نہ لے انتقام محبت

زباں سے وہ کچھ ہی کہے جائیں لیکن
نگہ دے رہی ہے پیام محبت

ازل ابتدا ہے ابد انتہا ہے
نہ صبح محبت نہ شام محبت

یہ تھا کون غارت گر دین و ایمان
ارے لے دیا کس نے نام محبت

کہاں ان کی بزم طرب کے ہوں قابل
میں شوریدہ سر تلخ کام محبت

خطا تو خود ان کی اور الزام ہم پر
سب الٹا ہی دیکھا نظام محبت

مٹے فرق وصل و فراق من و تو
جو ہو جائے راسخ مقام محبت

کوئی مزہ نہیں کوئی خوشی نہیں

تیرے بغیر زندگی موت ہے زندگی نہیں

حال میں اپنے مست ہوں غیر کا ہوش ہی نہیں

رہتا ہوں میں جہاں میں یوں جیسے یہاں کوئی نہیں

مجھ میں کبھی ہنر سہی تاب تو ضبط کی نہیں

شرط وفا وہاں بھی اور یہاں بھی نہیں

کیسے ہو درد دل بیاں اف ہے نفس نفس فغاں

کچھ ہو کسی کی داستاں میری سی دکھ بھری نہیں

دل ہے امید و بیم میں کشمکش عظیم میں

بیٹھے ہوئے حریم میں ہاں ہے کبھی کبھی نہیں

مے یہ ملی نہیں ہے یوں قلب و جگر ہوئے ہیں خوں

کیوں میں کسی کو مفت دوں دل میرے مفت کی نہیں

میکشو یہ تو میکشی رندی ہے مے کشی نہیں

آنکھوں سے تم نے پی نہیں آنکھوں کی تم نے پی نہیں

ٹھہرے گا دل تھمیں گے اشک آہ مگر ابھی نہیں

غم ہے یہ دل لگی نہیں رونا ہے یہ ہنسی نہیں

○

غریبوں میں جا کر رہا چاہتا ہوں میں اب زندگی بے ریا چاہتا ہوں
میں اس بیوفا سے وفا چاہتا ہوں مجھے دیکھئے کس سے کیا چاہتا ہوں
نہیں وصل کی بھی ہوس میرے دل میں کسی کو میں بے انتہا چاہتا ہوں
خوشی وصل کی ہے نہ فرقت کا غم ہے بہرحال تیری رضا چاہتا ہوں
مرا ساز ہستی ہے لبریز نغمہ کوئی مطرب خوشنوا چاہتا ہوں
کرم کے بھروسے میں کتنا جری ہوں خطا کر کے ان سے عطا چاہتا ہوں
وفا کر کے اس کا صلہ چاہتا ہوں بڑا نا سزا ہوں سزا چاہتا ہوں
ترے وصل کی تاب کیا لا سکوں گا تعلق فقط دور کا چاہتا ہوں
جو پوچھا ادا سے تو بس بھول بیٹھا کھڑا سوچتا ہوں کہ کیا چاہتا ہوں

○

نہ لیڈر بن کے اطراف جہاں میں نام پیدا کر
نہ لیکچر دے کے ہر جلسہ میں اک کہرام پیدا کر
بس اپنے دل میں مسلم جذبۂ اسلام پیدا کر
جو لبریز مے توحید ہو وہ جام پیدا کر

○

آئینہ بنتا ہے رگڑے لاکھ جب کھاتا ہے دل
کچھ نہ پوچھو دل بڑی مشکل سے بن پاتا ہے دل

عشق میں دھوکے پہ دھوکے روز کیوں کھاتا ہے دل
ان کی باتوں میں نہ جانے کیوں یہ آجاتا ہے دل

کٹ گئی اک عمر اس افہام اور تفہیم میں
دل کو سمجھاتا ہوں میں اور مجھکو سمجھاتا ہے دل

فصل گل میں سب تو خنداں ہیں مگر گریاں ہوں میں
جب تڑپ اٹھتی ہے بجلی مجھکو یاد آتا ہے دل

کچھ نہ ہم کو علم رستہ کا نہ منزل کی خبر
جارہے ہیں بس جدھر ہم کو لئے جاتا ہے دل

○

سالک ہیں مگر جذب کا رکھتے ہیں اثر ہم
جانا تو کدھر ہم کو ہے جاتے ہیں کدھر ہم

ناچیز ہیں پھر بھی ہیں بڑی چیز مگر ہم
دیتے ہیں کسی ہستیٔ مطلق کی خبر ہم

پاتے نہیں دنیا میں بلاؤں سے مفر ہم
سایہ کی طرح ساتھ ہیں جاتے ہیں جدھر ہم

اٹھ جائے ابھی کام لیں ہمت سے اگر ہم
اک یونہی سا پردہ ہے ادھر وہ ہیں ادھر ہم

دم بھر تو بھلا کوئی نہیں جی کے دکھا دے
کر لائے ہیں جس حال میں اک عمر بسر ہم

ہر دم جو تصور میں ہے ان کا رخ روشن
پاتے ہیں شب غم میں بھی آثار سحر ہم

اس ناز سے اس شان سے اس تیز روی سے
گذروگے تو دنیا ہی سے جائیں گے گزر ہم

○

ہر تمنا دِل سے رخصت ہو گئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہو گئی

یاس ہی اب دِل کی فطرت ہو گئی
آرزو جو کی وہ حسرت ہو گئی

دل میں داغوں کی وہ کثرت ہو گئی
رونما اک شانِ وحدت ہو گئی

ایسی ضد کا کیا ٹھکانہ ہے بھلا
بات جو کہہ دی وہ قسمت ہو گئی

غیر سے باتیں ہیں ہم سے عذر تھا
آج تم کو خوب فرصت ہو گئی

پڑ گئی تھی ان پہ بھولے سے نظر
بات آئی تھی قیامت ہو گئی

اس کو ہر ذرہ ہے اک دنیائے راز
منکشف جس پر حقیقت ہو گئی

○

گھٹا اٹھی ہے تو بھی کھول زلف عنبریں ساقی
ترے ہوتے فلک سے کیوں ہو شرمندہ زمیں ساقی

میں فطری مست ہوں میرے ہزاروں ہم نشیں ساقی
شجر ساقی حجر ساقی فلک ساقی زمیں ساقی

نہ چھیڑ اے محتسب میں ہوں مئے وحدت کا متوالا
میں وہ میخوار ہوں جس کے ہیں ختم المرسلیں ساقی

دم آخر تو اٹھ جائے یہ چشم سرمگیں ساقی
نگاہ مست ملتے ہی نگاہ واپسیں ساقی

کہاں سے مجھ کو پہنچایا کہاں پیر مغاں تو نے
مرا میخانہ اب لاہوت ہے روح الامیں ساقی

گدائے میکدہ ہوں مست ہوں اپنی گدائی میں
یہ ہے سنگ در میخانہ مجھ کو شہ نشیں ساقی

یہیں سے پاؤں گا ہر نعمت دنیا و دیں ساقی
کہیں کیوں جاؤں ترے میکدے میں کیا نہیں ساقی

○

○

میں ہوں اور حشر تک اس دَر کی جبیں سائی ہے
سرِ زاہد نہیں یہ سر سرِ سودائی ہے

دِل ازل سے ہے کوئی آج کا شیدائی ہے
تھی جو اک چوٹ پرانی وہ ابھر آئی ہے

تھے کہاں گردشِ تقدیر کہاں لائی ہے
بادہ پیمائی تھی یا بادیہ پیمائی ہے

رنگ رلیوں پہ زمانے کے نہ جانا اے دل
یہ خزاں ہے جو بہ اندازِ بہار آئی ہے

نازِ تقویٰ سے پھر اچھا ہے نیازِ زندی
جاہِ زاہد سے پھر اچھی میری رسوائی ہے

اللہ اللہ ترے آتے ہی ہجوم اشکوں کا
حسرتِ دید بھی مشکل سے نکل پائی ہے

ساری دنیا کی نگاہوں سے گرا ہے مجذوبؔ
تب کہیں جا کے ترے دل میں جگہ پائی ہے

○

دلیرانہ نظم

○

افتقار

وقت عمل کب آئیگا ہم ہیں کبھی انتظار میں — اب بھی ہے کیا کوئی کسر ذلت و افتقار میں

گو ہیں عدو بڑھے ہوئے زور میں اور شمار میں — فتح و شکست ہے مگر قبضۂ کردگار میں

گو ہیں ضعیف و ناتواں گو ہیں نحیف و خستہ جاں — رکھتے ہیں ہم مگر نہاں شیر کا دل کنار میں

جبکہ خدا پہ تھی نظر کچھ نہ تھا دشمنوں کا ڈر ! — دس بھی ہوئے تو بے خطر گھس گئے ہم ہزار میں

کفر ہے دیں پہ حکمراں زیر زمیں ہے آسماں — ہو گیا منقلب جہاں گردش روزگار میں

رکھتے ہیں فوق ہم پہ سب کرتے ہیں ظلم روز و شب — ایسے تھے ہم ذلیل کب فرد تھے روزگار میں

کیسا یہ انقلاب ہے دیکھ کے دل کباب ہے — کہتے ہیں اب ثواب ہے سود میں اور قمار میں

دنیا گلے کا ہار ہے دین نظر میں خار ہے — (یہ بھی) اگر بہار ہے آگ لگے بہار میں

جو ہے وہ مادہ پرست بندۂ زر ہوا پرست — رہ گئے کم خدا پرست ایک ہے اب ہزار میں

ہوش میں آؤ بھائیو ایسی نہ زندگی جیو

بادۂ سرمدی پیو اب نہ رہو خمار میں

○

اشاریہ

سیرت النبی ﷺ
کے
موضوع پر ہماری دیگر کتب

- سیرت النبیؐ ــــــ شبلی نعمانی
- رحمۃ للعالمینؐ ــــــ قاضی سلیمان منصور پوری
- محبوبِ خدا ــــــ چودھری افضل حق
- حیاتِ سرورِ کائنات ــــــ مارٹن لنگس / سید معین الدین احمد قادری
- سیرتِ طیبہ محمد رسول اللہؐ ــــــ مولانا عبد المقتدر
- نبی اکرمؐ بطور ماہر نفسیات ــــــ سیدہ سعدیہ غزنوی
- حدیث نبوی اور علم النفس ــــــ ڈاکٹر محمد عثمان نجاتی / فہیم اختر ندوی
- بچوں کے رسولؐ ــــــ آغا اشرف
- معراج اور سائنس ــــــ ״
- رسول کریمؐ کی جنگی سکیم ــــــ عبد الباری
- سیرت المصطفےٰ بزبان امیر المومنین سیدنا علی المرتضیٰؓ ــ مرتبہ ابن عبد الشکور
- تعلیماتِ نبویؐ ــــــ مولانا محمد سلیمان فرخ
- طب نبوی اور جدید

الفیصل ناشران و تاجران کتب غزنی سٹریٹ

تذکرۂ خواجہ عزیز الحسن مجذوب غوری رح

پروفیسر احمد سعید

الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور